شعر العجم

حصّۂ سوم

فغانی شیرازی سے ابوطالب کلیم تک

مادۂ تاریخ اختتامِ تصنیف	مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تذکرہ	تاریخِ عجم
سنہ ۱۳۲۵	سنہ ۱۳۲۴

مُصنّفہ

مولنا شبلی نعمانی

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں طبع ہوئی

طبع چہارم   قیمت فی جلد ۳ر   سنہ ۱۹۴۵ء

فہرست مضامین
شعر العجم حصۂ سوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
تمہید	۱-۲۳	فیضی کا مذہب	۵۴
فارسی شاعری کا دور آخر	۱	تصنیفات	۵۵
تیموری دور میں شاعری	۳	شاعری	۶۲
اس دور کی خصوصیتیں	۱۷	عرفی شیرازی	۶۳-۱۱۹
فغانی شیرازی	۲۴-۲۷	نام ونسب اور تعلیم	۶۳
وطن اور ابتدائی پیشہ	۲۴	ابوالفتح کے دربار میں رسائی	۶۶
کلام پر رائے	۲۵	عرفی اور خانخاناں	۷۷
فیضی	۲۸-۶۲	جہانگیر کے دربار میں رسائی	۸۰
فیضی کا خاندان اور ولادت	۲۹	وفات	۸۱
دشمنوں کی مخالفت	۳۱	اخلاق وعادات	۸۲
دربار اکبری میں رسائی	۳۴	تصنیفات	۸۵
ملک الشعرائی کا خطاب	۳۹	دیوان کی ترتیب	۸۶
دکن کی سفارت	"	کلام پر رائے	۸۸
وفات	۴۳	نظیری کی نکتہ چینی	۸۹
عام حالات اور اخلاق وعادات	"	فیضی کی رائے	۹۰

مضمون	صفحہ
عرفی کی شاعری کی خصوصیات	۹۱
عشقیہ شاعری	۱۰۵
فلسفہ	۱۱۰
نظیری نیشاپوری	۱۲۰-۱۴۷
نام و وطن	۱۲۰
عام حالات اور اخلاق و عادات	۱۲۶
نظیری کی خصوصیات	۱۲۹
پہلی خصوصیت	〃
دوسری خصوصیت	۱۳۲
تیسری خصوصیت	۱۳۴
چوتھی خصوصیت	۱۳۶
پانچویں خصوصیت	۱۳۹
چھٹی خصوصیت	۱۴۱
ساتویں خصوصیت	۱۴۴
ٹھویں خصوصیت	۱۴۶
طالب آملی	۱۴۸-۱۶۸
ہندوستان میں آنا	۱۵۰
عبداللہ خاں حاکم گجرات کا طلب کرنا	۱۵۳
جہانگیر کے دربار میں رسائی	۱۵۶
اعزہ و اولاد	۱۶۰
اخلاق و عادات	۱۶۱
شاعری	۱۶۶
میرزا صائب اصفہانی	۱۶۹-۱۸۳
ولادت و تعلیم و تربیت	۱۷۰
ہندوستان میں آنا	۱۷۱
مرزا صائب اور ظفر خاں	۱۷۲
مراجعت وطن	۱۷۴
عام حالات و عادات	۱۷۵
مرزا صائب کی بیاض	۱۷۹
کلام پر رائے	۱۸۱
ابو طالب کلیم	۱۸۴-۲۰۶
شاہجہاں کے دربار میں رسائی	۱۸۷
عام حالات	〃
شاعری	۱۸۹
قصائد	۱۹۱
غزل	۱۹۵
قوت تخیل	۱۹۹
روزمرہ اور محاورہ	۲۰۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایرانی شاعری

کا

دورِ آخر

ایران میں تیموری خاندان کا اخیر فرمان روا، سلطان حسین مرزا تھا، اس کے آخری زمانے میں سلطنت صفویہ کا آغاز ہوا، جس کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ شیخ صفی الدین اردبیلی، ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے، اون کی اولاد میں سلطان حیدر ایک بزرگ پیدا ہوئے جن کے مرید قرمزی رنگ کی بارہ گوشے کی ٹوپی پہنتے تھے، اور اس مناسبت سے قزلباش کہلاتے تھے، جس کا لفظی ترجمہ سرخ سر ہے، وہ ایک معرکہ میں شہید ہوئے، ان کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل نے محرم ۹۰۵ھ ہجری میں ستر آدمیوں کے ساتھ آذربائیجان پر چڑھائی کی اور رفتہ رفتہ اپنی جماعت اس قدر بڑھائی کہ شروان پر حملہ آور ہوکر وہاں کے فرماں روا کو شکست دی، انھوں نے ۲۵ برس کی مدت میں ایک وسیع سلطنت قائم کر لی اور حکومتِ صفویہ کی بنیاد ڈالی، ۹۳۰ھ ہجری میں انکا انتقال ہوگیا،

ان کے بعد ان کے بیٹے طہماسپ نے سلطنت کو اور زیادہ ترقی دی، چنانچہ فوج کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہنچائی اور دُور دُور تک کے صوبے فتح کرلئے،

۵۵ برس حکومت کرکے سنہ ۹۸۴ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کا بیٹا اسمٰعیل مرزا اور پھر اسکے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس سنہ ۹۹۵ ہجری میں فرماں روا ہوا۔ شاہ عباس وسعت حکومت اور انتظامات ملکی میں دوسرا اکبر یا شاہجہاں تھا، اس نے ایران کو اس سرے سے اُس سرے تک زیر نگیں کیا، ازبکوں سے خراسان چھینا، آرمینیہ پر فتح حاصل کی، عراق عرب کو مسخر کیا، ترکوں سے برابر کی صلح کی، غرض خراسان سے لے کر عراق تک اس کی حدود حکومت میں آگیا۔ اس نے ملک کے امن و امان آبادی اور سرسبزی کے لئے جو جو کام کئے، ہندوستان کا تیموری خاندان بھی نہ کر سکا، ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک کارواں سرائیں بنوائیں، جن میں مسافروں کے لئے سلطنت کی طرف سے تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں، والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے:

"جمیع عمارات معظمہ ایران بنا کردۂ آں شہریار است، چندیں شہر در مازندران و خراسان و عراق و آذربائجان ساختہ است، خصوصاً اصفہان را کہ رشک جناں نمودہ قانونے بجہت مہمانداری مسافران بحر و بر بستہ بود کہ در جمیع مراحل و منازل از یک ہزار و از ہزار تا دہ ہزار از غریب و تونگر از رعیت و سپاہ کہ از بومی و غریب ہر کس وہر قدر بودند، در کارواں سراہا کہ ساختہ است، ہرگاہ وارد می شدند، ہماں لحظہ مایحتاج حتی بستر و فراش در خور ہر کس ملازمان شاہی کہ بایں کار گماشتہ بودند، حاضر می کردند و ظروف در کمال تکلف از چینی و غوری وغیرہ در ہر منزل و مکان آں قدر بودہ کہ ہمہ مسافران را کفایت ہمی کرد و باز بہ تحویلداران مکان سپردہ می شد و ایں امر بیشتر از عراق تا مازندران بودہ و در اطراف و بلاد دیگر نیز رواج داشتہ لیکن نہ بایں افراط۔"

شاہ عباس نے ۴۴ سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۱۰۳۸ ہجری میں وفات پائی، اس کے

بعد شاہ صفی اور اس کے بعد شاہ عباس ثانی تخت نشیں ہوا، اور ۱۰۷۷ھ ہجری میں وفات پائی،

اس خاندان نے اگرچہ سنی مذہب کو نہایت ظلم اور بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ ایران سے معدوم کر دیا یعنی جو لوگ شیعہ مذہب قبول نہیں کرتے تھے وہ قتل کر دئے جاتے تھے، چنانچہ مآثر الامرا وغیرہ میں اس کی متعدد داستانیں نقل کی ہیں،

لیکن بہرحال تمام ملک میں یکسوئی پیدا ہو گئی، اتنا بڑا وسیع ملک جھگڑوں سے پاک ہو گیا، تمدن و تہذیب[1] کو نہایت ترقی ہوئی، ہر چیز میں حد سے زیادہ نفاست اور تکلف شروع ہوا، اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا، اور اس لئے شاعری میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہو گئی،

صفوی خاندان خود صاحب علم و فضل اور سخن سنج اور سخن شناس تھا، اس لئے اس نے شعر کی نہایت قدر و منزلت کی،

شاہ عباس ایک دفعہ کوکبۂ شاہی کے ساتھ جا رہا تھا، اُدھر سے حکیم شفائی مشہور شاعر آ رہا تھا، شاہ عباس نے سواری سے اتر جانا چاہا، شفائی نے بڑے اصرار سے روکا تاہم امرا اور درباری گھوڑے سے اتر پڑے[2]، شاہ عباس اکثر مسیح کاشی کے گھر اُن سے ملنے جایا کرتا تھا،

چونکہ اُسی زمانے میں ہندوستان میں تیموری خاندان شاہانہ فیاضیوں کا دریا بہا رہا تھا اور ایران کے شعرا دولت کی کشش سے ادھر کھچے چلے آتے تھے، اس لئے صفوی خاندان اور بھی رقیبانہ حوصلہ مندیوں پر مجبور ہوتا تھا، لیکن ایران سے اس معرکہ میں آخر ہندوستان

---

[1] خدانخواستہ اس کے یہ معنی نہیں کہ سنی مذہب کے مٹانے کو تہذیب و تمدن میں دخل ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مذہبی نزاعیں مٹ جائیں تو ضرور ملک میں ترقی ہو گی، اگر ایران میں شیعہ مذہب بالکل مٹ جاتا تب بھی یہی نتیجہ ہوتا [2] سرد آزاد،

کی نے بازی جیتی،

ہندوستان میں اگرچہ شاعری بابر کے ساتھ آئی، چنانچہ آتشی قندھاری جس کا یہ مطلع مشہور ہے

سر شکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن
بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن

بابر[1] کے ساتھ ہندوستان میں آیا، لیکن شاعری کی تربیت **بیرم خانخاناں** سے شروع ہوئی، وہ خود پختہ کار شاعر تھا اور ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتا تھا، اکثر شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے، **نظیری** سمرقندی نے اس کے اشارہ سے شاہنامۂ ہمایونی لکھنا شروع کیا تھا، اور کئی داستانیں نظم کیں، چنانچہ جب سکندر لودی کا معرکہ نظم کر کے سنایا تو بیرم خانخاناں نے اس پر نکتہ چینی کی، نظیری نے بیرم خاں کی اصلاح اور ہدایت کے موافق ایک رات میں چار سو شعر لکھ کر سنائے، اور بیش بہا صلہ حاصل کیا، بدایونی نے بعض اشعار نقل بھی کئے ہیں،

اکبر گو امی تھا لیکن نہایت خوش ذوق اور قدر دانِ سخن تھا، اس نے ملک الشعرائی کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے **غزالی** مامور ہوا، اکبر کی فیاضیاں دیکھ کر ایران کے تمام شعرا ہندوستان میں امنڈ آئے، اکبری شعرا کی فہرست جو ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں درج کی ہے حسب ذیل ہے:

حکیم[1] سنائی، غزالی[2]، عرفی[3]، نظیری[4] نیشاپوری، حزنی[5] اصفہانی، قاسم[6] کاہی، میلی[7] ہروی، جعفر[8] بیگ قزوینی، خواجہ[9] حسین مروی، حیاتی[10] گیلانی، شکیبی[11] صفاہانی، انیسی[12] شاملو، صالحی[13] ہروی، محوی[14] ہمدانی، صرفی[15] ساوجی، قراری[16] گیلانی، عتابی[17] نجفی، صوفی[18] مازندرانی، جدائی[19] مرزی، وقوعی[20] نیشاپوری، خسروی[21] قائنی، وفائی[22] سپاہانی، شیخ[23] ساقی، رفیعی[24] کاشانی، غیرتی[25] شیرازی، حالتی[26]، سنجر[27] کاشی، جذبی[28]، تشبیہی[29] کاشی، اشکی[30] قمی، اسیری[31] رازی، فہمی[32] رازی، قیدی[33] شیرازی، پیروی[34] ساوجی، کامی[35] سبزواری، پیامی[36]، سید[37] محمد ہروی

[1] بدایونی جلد سوم ص۱۸۱،

قدسی کربلائی، حیدری تبریزی، سامری، قربی نشاپور، فسونی شیرازی، نادری ترشیزی، نوعی مشہدی، بابا طالب اصفہانی، سرمدی اصفہانی، دخیل اصفہانی، قاسم ارسلان مشہدی، غیوری حصاری، قاسمی مازندرانی، رہی نیشاپوری،

یہ وہ لوگ ہیں جو دربار میں پہنچے،

ابوالفضل ان ناموں کو لکھ کر کہتا ہے، "و آنانکہ سعادت بار نہ یافتند واز دور دستہا گیتی خداوند را ستایشگر بس انبوہ، چوں قاسم گونابادی، ضمیری سپاہانی، وحشی بافقی، محتشم کاشی، ملک قمی، ظہوری ترشیزی، ولی دشت بیاضی، نیکی، صبری، ذگاری، حضوری، قاضی نوری، صافی، طوفی طبریزی، رشکی ہمدانی، ان میں سے بھی بجز دو تین کے سب ہندوستان میں آئے تھے،

اکبر و جہانگیر وغیرہ سلاطین خود صاحب مذاق اور نکتہ سنج تھے، اس لئے شعراء فن شعر میں ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کے ساتھ چونکہ تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ہر شاعر دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا تھا، اس لئے خود بخود ان سخن سنجوں کے کلام میں زور پیدا ہوتا جاتا تھا، اور ہر ایک اپنے کلام میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کرتا تھا،

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں کیں، اور نقادانِ فن نے اس کی تنقید کی داد دی، ایک دفعہ کسی نے **فغانی** کا یہ شعر پڑھا،

تعالیٰ آفتابِ من بدیں اعزاز می آید   مسیحا یار و خضرش ہمرکاب و ہم عنان عیسیٰ

اکبر نے برجستہ اصلاح دی **مصرع**   تعالیٰ شہسوارِ من بدیں اعزاز می آید

جہانگیر کا ذوقِ شاعری اسی قدر صحیح تھا جس قدر ایک بڑے نقادِ فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا، طالب آملی ایک مدت تک اس کے دربار میں شاعری کرتا رہا، لیکن اس نے ملک الشعرائی کا خطاب اسکو

اس وقت دیا جب وہ درحقیقت اس منصب کے قابل ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے:

"دریں تاریخ (تخت نشینی کے چودھویں سال) طالب آملی بخطاب ملک الشعرا خلعت امتیاز پوشیدہ، چوں رتبہ سخنش از ہمگناں در گزشت، در سلک شعرائے پایۂ تخت منتظم گشت، ایں چند بیت ازوست"

پھر چند شعر طالب آملی کے انتخاب کئے ہیں کہ خود طالب آملی اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا،

ایک دفعہ خانخاناں نے یہ غزل طرح کی ع ہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید، مراد صفوی اور مرزا مراد نے بھی اس طرح میں غزلیں لکھیں، طرح کا مصرع چونکہ نہایت شگفتہ تھا جہانگیر نے فی البدیہہ مطلع کہا،

ساغرے بر رخِ گلزار[1] می باید کشید ابر بسیارست مے بسیار می باید کشید

طرح کا مصرع جامی کی غزل کا ہے، جہانگیر نے پوری غزل نکلوا کر دیکھی، لیکن چونکہ یہی ایک مصرع کام کا تھا، تزک میں لکھتا ہے:

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبد الرحمن جامی ست، غزل او تمام بنظر درآمد غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان زدِ روزگار شدہ دیگر کارے نساختہ بغایت سادہ و ہموار گفتہ[2]"

ایک دفعہ دربار میں امیر الامرا کا یہ شعر پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق یک زندہ کردنِ تو بصد خوں برابرست

جہانگیر کے اشارے سے سب نے اس پر غزلیں لکھیں، جہانگیر نے ملا احمد مہر کن کا شعر پسند کیا،

---

[1] بر رخ گلزار یعنی گلزار کے سامنے [2] تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ ص ۳۳۳،

چنانچہ یہ تمام واقعہ خود تزک میں لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:

"بہ تقریبے ایں بیت امیر الامراء خوانده شد، ع گنبذ مسیح از سر ما کشتگان عشق

چوں طبع من موزوں ست، گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصراعے و رباعی، یابیتے

در خاطرم سر می زند، ایں بیت بر زبان گذشت"

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس   یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابر است

چوں خوانده شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمیں بیتے گفتہ گذرانید، علی احمد

مہر کن کہ احوال او پیش ازیں گذشت، بد نہ گفتہ بود،

اے محتسب[1] زگریہ پیر مغاں بترس   یک خم شکستنِ تو بصد خوں برابر است

فرہنگ جہانگیری جب جہانگیر کے سامنے اس کے مصنف نے پیش کی تو جہانگیر نے

نہایت قدر دانی کی چنانچہ لکھتا ہے،

میر عضد الدولہ از آگرہ آمده ملازمت نمود، فرہنگے کہ در لغت ترتیب داده بنظر

در آورد، الحق محنت بسیار کشیده و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علمائے قدما

مستشہد آورده، دریں فن کتابے مثل ایں نمی باشد[2]،

ایک دفعہ[3] ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیده لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا ع

اے تاجِ دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا ورنہ

تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کرکے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت بر سرت"

اور یہ سخت بے ادبی ہے،

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۱۱ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۹ [3] تذکرہ سرخوش، ذکر جہانگیر،

اس زمانے میں مئی تخلص ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی دربارو ں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی، مئی نے بہ تقریب شاعری نور جہاں بیگم کے ذریعہ سے جہانگیر کے دربار میں رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن چونکہ نور جہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، مئی نے یہ شعر پڑھا،

مئی بگریہ سرے دارد اے نصیحت گر　　کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے کہا دیکھا دہی اپنے پیشے کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نور جہاں بیگم نے تقریب کی، مئی نے مطلع پڑھا،

من میردم و برق زناں شعلۂ آہم　　اے ہمنفساں دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنسکر کہا وہ اثر کہاں جاسکتا ہے[1]،

سلسلۂ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، جہانگیر کی لائف لکھنی مقصود نہیں لیکن یہ دکھانا ہے کہ ان سلاطین کے دربار میں شعر و شاعری کو جو ترقی ہوئی، وہ صرف اس لئے نہ تھی کہ شاعری سے دولت ہاتھ آتی تھی بلکہ زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ یہ سلاطین خود موزوں طبع تھے، نقاد فن تھے، اچھے برے کی تمیز رکھتے تھے، موقع بہ موقع شعراء کو ٹوکتے رہتے تھے، ان کو صحیح داد دیتے تھے، اس لئے اُن کے دربار حقیقت میں شاعری کی تعلیم گاہ تھے،

دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی قدردانی اور فیاضی نے بیجاپور کو ایران کا ٹکڑا بنا دیا تھا، ظہوری اور ملک قمی اس کے دربار کے ملازم تھے، اور اکبری شش بھی ان کو دلی اور آگرے نہ کھینچ سکی، برہان پور میں نظام شاہ بحری گویا اس فن کا مربی تھا، ظہوری نے

---

[1] تذکرۂ سرخوش ذکر مئی،

ساقی نامہ اسی کی شان میں کہا ہے، جس کا بیش بہا صلہ عطا ہوا،

ہندوستان کی یہی فیاضیاں تھیں جن کی بنا پر تمام ایران ادھر کھنچا چلا آتا تھا، خود شعراء کی زبان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

میرزا صائب

ہمچو عزمِ سفرِ ہند کہ در ہر دل ہست　　رقصِ سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ابوطالب کلیم

اسیرِ ہندم و زیں رفتنِ بیجا پشیمانم　　کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغِ بسمل را

بہ ایراں میرود نالاں کلیم از شوقِ ہمراہاں　　بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

ز شوقِ ہند زاں ساں چشمِ حسرت بر قفا دارم　　کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

علی قلی سلیم

نیست در ایران زمیں سامانِ تحصیلِ کمال　　تا نیامد سوئے ہندوستاں حنا رنگیں نشد

دانش مشہدی

راہ دورِ ہند پابستِ وطن دارد مرا　　چوں حنا شب درمیاں رفتن بہ ہندوستاں خوش ست

ہندوستان کی قوتِ کشش اس زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہمیشہ سے اس کی قدردانی کے شہرے ایرانیوں کے لئے دامِ تسخیر تھے، خواجہ حافظ کو بادشاہ بغداد نے بارہا بلایا لیکن جگہ سے نہ ہلے، شیراز ہی میں بیٹھے بیٹھے غزلیں لکھ کر بھیجدیں، لیکن دکن سے تحریک ہوئی تو جہاز میں سوار ہو کر ہرمز تک آئے، جامی ایران میں تھے لیکن قصیدے ہندوستان میں بھیجتے تھے،

جامی اشعارِ دلآویز تو جنسے ست لطیف　　پودش از حسن بود و ز سرِ معنے تارش

ہمرہ قافلۂ ہند رواں کن کہ رسد شرفِ عزِّ قبول از ملک التجارش

علی نقی کمرہ نے ۵۳ شعروں کا قصیدہ فیضی کی مدح میں لکھ کر بھیجا جس میں کہتا ہے،

مرا فگند بر نظم اموم پرتو فیضی ابو الفیض آں گزین اکبرو شیخ کبیر من

ہندوستان میں، سلاطین اور شہزادوں کے علاوہ امرا اکثر سخن فہم اور قدردان تھے ان میں **ابوالفتح** گیلانی اور عبد الرحیم **خانخاناں** نے شاعری کی اکاڈیمی (بیت العلماء) قائم کی جس کی بدولت شعراء نے اس فن میں نہایت ترقی کی، ابوالفتح ایک خط میں خانخاناں کو لکھتا ہے:

"قصائدے کہ یاراں آں جا گفتہ بودند بشعراے ایں جا فرمودہ شد بنام نامی شما ہر گاہ بہ اتمام می رسد بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد، ملا عرفی وملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند"[1]

عبد الباقی مآثر رحیمی میں لکھتا ہے:

"اکثرے از اعیان دولت وارکان سلطنت بادشاہ مرحوم (اکبر) دست گرفتہ و تربیت کردہ وے (حکیم ابو الفتح) اند و ہر کہ تازہ از ولایت آمدہ بندگی و متعاہت ایشاں اختیار می نمودہ، چنانچہ خواجہ حسین ثنائی و میرزا قلی میلی و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی و سائر مستعداں در خدمت او بودہ اند"

شعر کی تاریخی زندگی میں یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں آکر فارسی شاعری نے ایک خاص جدت اختیار کی جس کی تفصیل ہم کسی آیندہ موقع پر لکھیں گے، یہ جدت حکیم ابوالفتح کی تعلیم کا اثر تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

و مستعداں و شعر سنجاں ایں زمان را اعتقاد آں ست کہ تازہ گوئی کہ دریں زمان

---

[1] چہار باغ یعنی مکاتیب حکیم ابو الفتح،

در میانہ شعرا مستحسن است و شیخ فیضی، و مولانا عرفی شیرازی وغیرہ بہ آں روش حرف زدہ اند'
بہ اشارہ و تعلیم ایشاں (حکیم ابو الفتح) بودہ (مآثر رحیمی تذکرۂ حکیم حاذق)

اسی طرح **خانخاناں** کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری کے حق میں ابر کرم کا کام دیا، خانخاناں نے احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا' جس میں ہر فن کی نہایت نادر کتابیں جمع کیں، ایک عجیب خصوصیت اس کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر مشہور شعرا اس کے دربار میں تھے، ان کے دیوان خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے، اکثر شعرا، اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے، یہیں غزلوں کی طرحیں دی جاتی تھیں، شعرا مشاعرے کرتے تھے، خانخاناں خود بھی شریکِ صحبت ہوتا تھا' اور قدر دانی سے دل بڑھاتا تھا، خود بھی ان طرحوں میں غزلیں کہتا تھا:

کتب خانہ کا حال مآثر رحیمی کے مختلف مقامات میں درج ہے،

رسمی قلندر ایک ایرانی درویش شاعر تھا، اس نے خانخاناں کی تربیت شعر و شعرا کا ذکر ایک قصیدے میں تفصیل سے کیا ہے، چنانچہ خانخاناں کو مخاطب کرکے کہتا ہے:

زیُمنِ مدحِ تو آں نکتہ سنجِ **شیرازی**   رسید صیتِ کلامش بہ روم از خاور
(یعنی عرفی)
بطرزِ تازہ ز مدحِ تو آشنا گردید   چہ روے خوب کہ یابد ز ماشطہ زیور
زفیضِ نامِ تو **فیضی** گرفت چوں خسرو   بہ تیغِ ہندی اقلیمِ سبعہ راکیسر
زریزہ چینی خوانت **نظیری** شاعر   رسیدہ است بجاے کہ شاعرانِ دگر
کنند بہر مدیحش قصیدۂ انشا   ق   کہ خونِ رشک چکد از دلِ سخن پرور
سوادِ شعرِ **شکیبی** چو کحلِ اصفاہاں   بہ تحفہ سوے خراساں برند اہلِ نظر
ز مدحتِ تو **حیاتی** حیات دیگر یافت   بلے مقوی طبع عرض بود جوہر
حدیثِ **نوعی** و **کفوی** بیاں چہ سازم من   چو زندہ اند بمدحِ تو تا دمِ محشر

زنعمت تو بہ نوعی رسید آں مایہ — کہ یافت میر معزی ز نعمت سنجر

خانخاناں اس درجہ کا سخن سنج تھا کہ اگر وہ شاعری میں پڑتا تو عرفی اور نظیری کا ہمسر ہوتا، اس طرح ہیں، چندست، پندست، فرزندست تمام مشہور شعرا نے زور آزمائیاں کی ہیں، نظیری اور خانخاناں کی غزلیں ہم بالمقابل درج کرتے ہیں، دونوں کا خود موازنہ کرو

خانخاناں	نظیری
شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چندست	بحرف اہل غرض قرب بُعد ما بندست
جزایں قدر کہ دلم سخت آرزومندست	دل شکستۂ ما را ہزار پیوندست
بہ کیشِ صدق و صفا حرفِ عہد بیکارست	ازاں دمم کہ بحیرت فگندہ دیدن او
نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگندست	نگہ بگوشۂ چشمم ہنوز در بندست
نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم	نظر دلیر نہ شد تا مژہ پہ پیش آمد
کہ پائے تا بسرش ہر چہ ہست در بندست	حجاب اگر پرِ کاہست کوہ الوندست
مرا فروخت محبت و لے ندانستم	دو چشم ساکن بیت الحزن بمن گردید
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے من چندست	کہ من اسیر بمشوقم او بہ فرزندست
ادائے حقِ محبت عنایتی ست زدوست	دراز دستیِ حسن کہ گل بہ چشم ریخت
وگرنہ خاطرِ عاشق بہیچ خرسندست	کہ تا بدامنم از جیب در شکر خندست
ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکشِ تو رحیم	بہ کینہ جوئی افلاک عشق می بازم
کہ اندکے بہ ادائے عشق مانندست	کہ ہر کہ دشمن ما شد بہ دوست مانندست

نظیری از تو بجاں کندن ست لب بکشائے
بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسندست

دونوں غزلوں کے موازنہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن صاحبِ ذوق سمجھ سکتا ہے کہ خانخاناں کے کلام میں جو صفائی، شستگی، دلآویزی اور سوز و گداز ہے، نظیری کی غزل اس سے بالکل خالی ہے، خانخاناں کی فیاضی اور قدردانی سے جو شعرا اور اہلِ کمال اس کے دربار میں جمع ہوگئے سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی، مآثر رحیمی میں ان تمام شعراء کا مفصل تذکرہ ہے، عُرفی نے جب یہ قصیدہ پیش کیا ع

اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را

تو ایک لاکھ روپے دلوائے[۱]،

عرفی خانخاناں کی مدح میں خصوصیت کے ساتھ اپنے کمالِ سخن کی داد چاہتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ وہ خود اس فن کا حریف ہے، چنانچہ کہتا ہے،

سخن شناسا دیدی و دیدہ باشی ہم | علوِ پایۂ من در مقامِ سحبانی
فلاں مربی و من تربیت پذیراں بس | ز فضل خود چہ زنم لاف ہائے طولانی

مربیانِ سخن کے سلسلہ میں علی قلی خاں، خانِ زمان، خان اعظم کوکلتاش، غازی خاں، اور ظفر خاں کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خان زماں اکبری دربار کے امرائے کبار میں سے تھا، جو بالآخر حریف سلطنت بن کر مارا گیا، وہ خود شاعر اور قدردانِ سخن تھا، سلطان تخلص کرتا تھا، چنانچہ بدایونی نے شعراء کے ذیل میں اس کا حال لکھا ہے، اکثر شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے، ایک دفعہ جب اس نے یہ غزل لکھی،

باریک چو موے ست میانے کہ تو داری | گویا سر آں موست دہانے کہ تو داری

---

[۱] کلمات الشعراء، سرخوش ذکر خانخاناں،

تو اکثر شعرا نے اس کا تتبع کیا، ایک شاعر نے یہ مطلع لکھا،

گفتم کہ گمانے ست دہانے کہ تو داری　　گفتا کہ یقین ست گمانے کہ تو داری

غزالی جب ایران سے دکن میں آیا اور حسب دلخواہ اس کی قدر دانی نہیں ہوئی تو خان زماں نے ہزار روپیے اور چند گھوڑے بھیجکر بلایا اور یہ قطعہ لکھکر بھیجا،

اے غزالی بحقِ شاہِ نجف　　کہ سوے بندگان بچون آئے

چوں کہ بے قدر گشتہ، آں جا　　سرِ خود گیر زود بیروں آئے

"سرِ خود گیر" سے ہزار روپیے کا کنایہ تھا، کیونکہ غزالی کا پہلا حرف غ ہے جس کے عدد ہزار ہیں، غزالی دکن سے جون پور میں آیا اور جب تک خان زماں زندہ رہا، اس نے اور کسی دربار کی طرف رخ نہیں کیا، جون پور میں آکر اُس نے ایک مثنوی نقش بدیع لکھ کر پیش کی، جس میں ایک ہزار شعر تھے. خان زماں نے وہ صلہ دیا جو سلطان محمود نہ دے سکا تھا، (فی شعر ایک اشرفی) اس مثنوی کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتا ہوں کہ ناظرین خان زماں کی صحیح المذاقی کا اندازہ کر سکیں،

خاکِ دل آں روز کہ می بختند　　شبنمے از عشق بر و ریختند

دل کہ باں رشتۂ غم اندودشد　　بود کبا بے کہ نمک سودشد

بے اثر مہر چہ آب و چہ گل　　بے نمک عشق چہ سنگ چہ دل

ذوقِ جنوں از سر دیوانہ پرس　　لذتِ سوز از دلِ پروانہ پرس

خان زماں کے مرنے کے بعد غزالی اکبر کے دربار میں آیا، اور ملک الشعرا کے خطاب سے ملقب ہوا، خاندان تیموریہ میں یہ پہلا شخص تھا جو اس منصب پر ممتاز ہوا[1]،

---

[1] خزانہ عامرہ ذکر غزالی،

الفتی یزدی خان زماں ہی کے دربار میں ملازم تھا[۱]،

خان اعظم کوکلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا، اور اسکے ساتھ کا کھیلا تھا، اکبر اسکی ناز برداریاں کرتا تھا، اور کہتا تھا" چہ کنم درمیان من و خان اعظم دریاے شیر حائل ست"۔ خان اعظم نہایت قابل، نہایت نکتہ سنج اور بہت بڑا مورخ تھا، جہانگیر اس کی نسبت لکھتا ہے:

"در علم سیر و فن تاریخ استحضار تمام داشت و در تحریر و تقریر بے نظیر بود، و در مدعا نویسی ید طولیٰ داشت، و در لطیفہ گوئی بے مثل بود و شعر ہمواری می گفت[۲] این رباعی از واردات اوست"،

عشق آمد از جنوں برو مندم کرد | وارستہ ز صحبت خرد مندم کرد
آزاد ز بند دین و دانش گشتم | تا سلسلہ زلف کسے بندم کرد

ملاے بدایونی اس کی نسبت لکھتے ہیں:

"بہ انواع فضائل و ہنر موصوف است و بفہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر را از امراے نشاں نمی دہند"۔

ملا صاحب نے اس کا ذکر شعرا کے ذیل میں کیا ہے، اور اس کے اشعار بھی نقل کئے ہیں، ایک مطلع سننے کے قابل ہے،

گشت بیمار دل از رنج و غم تنہائی | اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی؟

خان اعظم نے اکثر شعرا کی تربیت کی جن میں سے جعفر ہروی، ہمتی، مدامی، بدخشی، مقیمی، سبزواری کا ذکر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے،

میرزا غازی قندھاری صوبہ دار تھا، ایران کے شعرا جو کابل اور قندھار کی راہ سے

---

[۱] بدایونی جلد سوم تذکرہ الفتی ص ۲۰۹ [۲] تزک جہانگیری،

ہندوستان میں آتے تھے، میرزا غازی ہی کے خوان کرم سے فیضیاب ہوتے تھے،

ظفر خاں صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اس کی استادی اور مربی گری کا اعتراف ہے، صائب ایک مدت تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی، ظفر خاں اس کے کلام میں موقع بموقع دخل اور تصرف کرتا تھا، صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی اسی کے اشارے سے کی، چنانچہ صائب ان باتوں کا احسانمندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے،

حقوقِ تربیت را کہ در ترقی باد ۔۔۔ زبان کجاست کہ در حضرتت فرو خوانم

تو جاں ز دخل بجا مصرع مرادادی ۔۔۔ تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم

ز دقت تو معنی شدم چناں باریک ۔۔۔ کہ می تواں بہ دل مور کرد پنہانم

چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود ۔۔۔ نہ داشت طرۂ شیرازہ روے دیوانم

تو غنچہ ساختی اوراق باد بردہ من ۔۔۔ وگرنہ خار نمے ماند از گلستانم

صاحبِ مآثر الامرا ظفر خاں کے حال میں لکھتے ہیں،

زرہا بردم ایران می داد خصوصاً در حق شعرا طرفہ بذل وکرم می فرمود سخنوران

لہ ظفر خاں کا نام احسن اللہ خاں اور احسن تخلص ہے، ظفر خاں کا باپ خواجہ ابو الحسن ۱۰۳۲ھ ہجری میں جہانگیر کا وزیر عظم مقرر ہوا اور کابل کی حکومت سنرا وار ہی ظفر خاں باپ کی نیابت میں کابل کا صوبہ دار ہو کر گیا شاہ جہاں نے ابو الحسن کو ۱۰۴۲ھ ہجری میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا جب وہ اسی سنہ میں انتقال کر گیا تو ظفر خاں کشمیر کا مستقل حاکم مقرر ہوا، ظفر خاں نے اپنے ایام حکومت میں تبت کو فتح کیا، اور ۱۰۸۱ھ ہجری میں وفات پائی، ظفر خاں صاحب دیوان ہے، ذیل کے شعر سے اسکی طبیعت کا اندازہ ہوگا،

دلم بکوے تو امیدوار می آید ۔۔۔ نگاہ دار کہ روزے بکار می آید

صاحب استعداد و دل از اوطان برداشتہ روی اُمید بدرگاہش می گذاشتند و بمنتہاے تمنا می رسیدند، افصح المتاخرین میرزا صائب تبریزی چوں از ایران بہ کابل رسید از گہر پوشی و دریا بخشی او دل بستہ محبتش گردیدہ"

ظفرخاں نے ایک عجیب مرقع طیار کرایا تھا، جو آج ہاتھ آتا، تو لاکھوں روپیے کو ارزاں تھا یعنی ایک بیاض تیار کرائی تھی، جس میں ہر شاعر اپنا منتخب کلام خود اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور صفحہ کی پشت پر اُس کی تصویر ہوتی تھی[1]

اس زمانے میں شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ مشاعروں کا رواج قائم ہوا، اس سے پہلے شعرا بطور خود، اساتذہ کی غزلوں پر غزل لکھتے تھے، اب (یعنی فغانی کے زمانے سے) یہ طریقہ قائم ہوا کہ کسی امیر صاحبِ مذاق کے مکان پر شعرا جمع ہوتے تھے، پہلے سے کوئی طرح دیدی جاتی تھی، سب اس طرح میں غزلیں لکھ کر لاتے تھے اور پڑھتے تھے، کبھی کبھی برسرِ محفل برابر کے دعویداروں میں چوٹ چل جاتی تھی، سوال و جواب ہوتے تھے اور اس طرح مسابقت اور حریف پیشگی شاعری کو ترقی دیتی جاتی تھی،

ان تمام مجموعی حالات نے شاعری پر جو اثر کیا، اور جو خصوصیتیں پیدا کیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) غزل کی ترقی،

اگرچہ اس زمانے میں قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، ان تمام اصنافِ سخن کا بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا، لیکن درحقیقت یہ عہد غزل کی ترقی کا عہد ہے، غزل میں مختلف اسٹائل (طرز) قائم ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:

واقعہ گوئی یا معاملہ بندی | یعنی اُن واقعات اور معاملات کا ادا کرنا جو عشق و عاشقی میں پیش آتے

---

[1] مآثر الامرا،

ہیں، ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ واقعہ گوئی کے موجد سعدی ہیں، اور امیر خسرو نے اس پر معتد بہ اضافہ کیا، لیکن اس عہد میں یہ ایک مستقل صنف ہوگئی جس کا بانی اول میرزا اشرف جہاں قزوینی ہے جو شاہ طہماسپ صفوی کا وزیر تھا مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں:

"چوں نوبت سخن سنجی بہ میرزا اشرف جہاں رسید طبع او مائل وقوع گوئی بسیار افتاد واین طرز را بحد کثرت رسانید"

شرف جہاں کا دیوان ہمارے کتب خانہ میں ہے، ہم اس سے اس کتاب کے چوتھے حصے میں کام لیں گے، یہاں ہم اس کے بعض اشعار اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ وقوع گوئی کا مفہوم سمجھ میں آسکے،

گوید کہ ایں ز عہد قدیم آشنای ماست ۔۔۔ باہر کہ بینمش چو بپرسم کہ کیست ایں
نظر بجانبِ من کرد و شرمسار شدم ۔۔۔ نہاں از و بہ رخش داشتم تماشائی
بمجلس گرمنِ بیدل از و حرفے نہاں پرسم ۔۔۔ چناں گوید جوابِ من کزاں گردد رقیب آگہ

شرف جہاں نے ۹۶۲ھ ہجری میں وفات پائی،

اس طرز کو جن لوگوں نے اپنا خاص موضوع بنایا تھا وحشی یزدی، علی قلی میلی اور علی نقی کمرہ ہیں، وحشی یزدی چونکہ رند اور اوباش مزاج تھا اور بازاری معشوقوں سے اس کو زیادہ سروکار رہا، اس لئے اس طرز کو اس نے کسی قدر اعتدال سے بڑھا دیا، واسوخت کی ابتدا بھی اسی نے کی اور اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہوگیا،

فلسفہ | غزل میں فلسفہ کی آمیزش عرفی نے خاص طور پر کی، لیکن اس طرز کو بہت ترقی نہیں ہوئی، اس کے ہمعصروں اور مابعد کے شعرا نے بہت کم اس طرز میں کہا،

مثالیہ | یعنی کوئی دعوی کرنا اور اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرنا، اس طرز کے بانی کلیم علی قلی

سلیم، میرزا صائب اور غنی ہیں، یہ طرز نہایت مقبول ہوا یہاں تک کہ شاعری کے خاتمے تک قائم رہا،

تغزل تغزل سے یہ مراد ہے کہ عشق اور عاشقی کے جذبات موثر الفاظ میں ادا کئے جائیں، یہ وصف اگرچہ لازمۂ غزل ہے لیکن نظیری نیشاپوری، حکیم شفائی اور علی نقی نے اس کو زیادہ نمایاں کیا، ان لوگوں میں اور وقوع گویوں میں یہ فرق ہے کہ وقوع گو شعرا ہوس پرست اور بازاری معشوقوں کے عاشق ہوتے ہیں، اور اسی قسم کے واقعات اور خیالات باندھتے ہیں، بخلاف اس کے متغزلین کا معشوق شاہد بازاری نہیں ہوتا، اور نہ ان کا عشق مبتذل اور اوباشانہ ہوتا ہے،

خیال بندی اور مضمون آفرینی یہ وصف تمام متاخرین میں ہے، لیکن اس طرز خاص کا نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے، جو شاہ جہاں کا ہمعصر ہے، شوکت بخاری، قاسم دیوانہ وغیرہ نے اس کو زیادہ ترقی دی، اور ہمارے ہندوستان کے شعرا بیدل اور ناصر علی وغیرہ اسی گرداب کے تیراک ہیں،

قصیدہ، قصیدہ کا ایک خاص طرز عرفی نے قائم کیا جس کی کوئی تقلید نہ کرسکا، ظہوری، طالب آملی، حسین ثنائی نے بھی اس صنف کو کچھ کم ترقی نہیں دی،

مثنوی، مثنوی بالکل اپنے درجے سے گر گئی، (فیضی اس سے مستثنیٰ ہے) مثنوی میں عموماً تاریخی واقعات یا اخلاقی مضامین ادا کئے جاتے ہیں، لیکن ان مضامین کے لئے سادگی اور پختگی درکار ہے، متاخرین ہر بات میں رنگینی کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے مثنوی مثنوی نہیں رہی، بلکہ غزل بن گئی، کلیم کاشانی ہمہاں نامۂ منظوم پڑھو رزم لکھتے ہیں، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط میں گانا ہو رہا ہے،

رباعی، یہ زمانہ اس امتیاز پر ناز کرسکتا ہے کہ رباعی نے فلسفہ کے تمام مسائل ادا کردیئے سحابی استرآبادی جو اکبر کا ہمعصر اور نجف میں معتکف تھا، اس نے کم از کم سترہ ہزار رباعیاں لکھیں جو سرتاپا فلسفہ سے مملو ہیں، اس کا ایک انتخاب جس میں سات ہزار رباعیاں ہیں ہمارے پاس ہے اور ہم شعرالعجم کے چوتھے حصہ میں جہاں فلسفیانہ شاعری پر بحث کریں گے اس کے کلام کا انتخاب پیش کریں گے، یہ تمام تفصیل خاص خاص انواعِ شاعری کے متعلق تھی، عام طور پر طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں جو جدتیں پیدا ہوئیں، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے، متاخرین کا یہ خاص انداز ہے، کہ جو بات کہتے ہیں پیچ دے کر کہتے ہیں، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو خیال کئی شعروں میں ادا ہو سکتا ہے اس کو ایک شعر میں ادا کرتے ہیں مثلاً قدسی کہتا ہے،

عیشِ ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل است　　کاش گل غنچہ شود تا دلِ ما بکشاید

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا باغ ایک نہایت مختصر باغ ہے، اس میں اسی قدر وسعت ہے کہ صرف ایک تنگ دل آدمی خوش ہوسکے، اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ میرا دل بھی شگفتہ ہو، اور پھول کی کلی بھی کھل سکے، اس بنا پر آرزو کرتا ہے کہ کاش پھول کلی بن جائے، تاکہ میرے دل کی شگفتگی کی گنجایش نکل سکے، اس مضمون کو فلسفیانہ نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ادا کرنا مقصود ہے کہ دنیا میں جب کسی کو فائدہ پہنچتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دوسرے کو نقصان پہنچا، کسی بادشاہ نے ملک فتح کیا، یعنی دوسرے کو شکست ہوئی، یہ خیال کسی حیثیت سے دیکھا جائے ایک شعر میں سمانے کے قابل نہ تھا، اس لئے جب ایک ہی شعر میں اس کو ادا کرنا چاہا تو خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا ہو گئی،

کبھی یہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مبالغہ یا استعارہ یا تشبیہ نہایت دور از کار ہوتی ہے، اس لئے سننے والے کا ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا، مثلاً شوکت بخاری کہتا ہے،

گوش ہا را آشیانِ مرغِ آتش خوارہ کرد برقِ عالم سوز یعنی شعلۂ غوغائے من

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو آہیں کیں اس قدر گرم تھیں کہ اس سے شعلے نکلے، یہ شعلے لوگوں کے کانوں میں پہنچے، یہانتک کہ لوگوں کے کانوں میں آگ بھر گئی، اس بنا پر مرغِ آتش خوار نے جس کی غذا آگ ہے کانوں میں اپنا گھونسلا بنا لیا کہ ہر وقت غذا ملتی رہے،

چونکہ کسی شخص کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا کہ آہ کی گرمی سے کان آتش کدے بنجائیں گے اس لئے مضمون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا،

(۲) اس زمانے کے اکثر مضامین کی بنیاد الفاظ پر اور صنعتِ ایہام پر ہے یعنی لفظ کے لغوی معنی کو ایک حقیقی بات قرار دے کر اس پر مضمون کی بنیاد قائم کرتے ہیں، مثلاً

امروز نیم شہرۂ عالم ز ضعیفی عمریست کہ از ضعف فتادم بزبانہا

"بر زبان افتادن" کے اصطلاحی معنے مشہور ہونا ہے، لیکن لغوی معنی "زبان پر پڑنا" ہے، مضمون کی بنیاد اسی لغوی معنی پر ہے کہتا ہے کہ کمزوری اور ضعف میں میں کچھ آج سے مشہور نہیں، ایک مدت ہے کہ میں زبانوں پر چڑھ گیا ہوں، زبان پر پڑنے کے معنی چونکہ اصطلاح میں مشہور ہونے کے ہیں، اس لئے یہ دعویٰ صحیح ہے، لیکن شاعر لغوی معنی لے کر ضعف کو یوں ثابت کرتا ہے کہ میں اس قدر ضعیف ہوں کہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھا پھرتا ہوں،

متاخرین کی شاعری سے اگر ایہام کو الگ کر دیا جائے، تو اُن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ دفعۃً برباد ہو جائے گا،

(۳) اس دور کا بڑا امتیازی وصف، استعارات کی نزاکت اور جدتِ تشبیہ ہے، تمدن کی ترقی میں جس طرح تمام اسبابِ معاشرت و تمدن میں تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح زبان اور خیالات میں بھی نزاکت اور تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً "آنکھیں فرشِ راہ ہیں،، گو بجائے خود اچھا استعارہ ہے، لیکن **نظیری** کہتا ہے،

می خواست بوسہ رخصتِ اقامت بگسترد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از فرش جبہ راہ بر آں خاک کو نہ بود

"بوسہ چاہتا تھا کہ بستر ڈالے لیکن اُسکی گلی میں اس قدر پیشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا کہ جگہ نہ تھی،،

یا مثلاً **شانی** کہتا ہے،

شانی دلت بکج کلہاں مائل ست باز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ایں لالہ را بطرفِ کلاہ کہ می زنی

یعنی اے شانی تیرا دل کج کلاہوں پہ مائل ہو رہا ہے،، اس پھول کو کس کی ٹوپی میں لگانا چاہتا ہے،

استعارات کی جدت و نزاکت، متاخرین کا عام انداز ہے، لیکن اس خاص وصف میں **طالب آملی** سب سے زیادہ ممتاز ہے،

(۴) اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں، مثلاً پہلے میکدہ، آتشکدہ وغیرہ مستعمل تھے، اب نشترکدہ، مریم کدہ وغیرہ ترکیبیں پیدا ہوئیں، یا مثلاً پہلے یک گلشن، یک چمن گل کہتے تھے، اب یک خندہ لب، یک آغوش گل، یک دیدہ نگاہ وغیرہ کہنے لگے،، اس قسم کی ترکیبیں **عرفی، فیضی، نوعی** نے کثرت سے پیدا کیں ان ترکیبوں

سے اکثر جگہ مضمون کا اثر بڑھ جاتا ہے، مثلاً

ع شکن بروی شکن خم بروی خم چیند،

ع موج بر موج شکستم چو بہ عماں رفتم

ع ہر یک لب خندہ نتواں منتِ شادی کشید

ع رُوئے بروئے حسن کن دست بدست ناز دہ

اس سے زیادہ یہ کہ ایک بڑا خیال ایک چھوٹے سے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے مثلاً یہ شعر

حریفِ سخت کمانے کہ در کمین دارم ۔۔۔ بہ دورگردیِ من از غرور می خندد

کہنا یہ تھا کہ میں معشوق سے محبت کرتا ہوں لیکن الگ الگ رہتا ہوں کہ تیرِ عشق کا گھائل نہ ہو جاؤں، لیکن معشوق میرے اس کترائے پھرنے پر ہنستا ہے کہ میری زد سے بچ کر کہاں جائیگا، اس خیال کے ادا کرنے کے لئے دورگردی کا لفظ نہ ہو تو ایک شعر میں یہ مطلب ادا نہیں ہو سکتا تھا،

چونکہ ان تمام خصوصیات کی زیادہ تفصیل ان شعرا کے کلام کے ذیل میں آئے گی جن کے ہاں یہ خصوصیات زیادہ پائے جاتے ہیں اس لئے اس موقع پر ہم اس گرہ کو زیادہ نہیں کھولتے

فغانی شیرازی

تمام اہلِ فن اور اربابِ تذکرہ کا اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں انقلاب پیدا ہو کر جو نیا دور قائم ہوا جو متاخرین اور نازک خیالیوں کا دور کہلاتا ہے، اس کا بانی فغانی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی اربابِ تذکرہ دو چار سطر سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے، بہر حال ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے وہ نذرِ احباب ہے،

فغانی کا وطن شیراز ہے، سام میرزا نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "پہلے چاقو بنایا کرتے تھے"، شاعری کا آغاز تھا کہ ہرات میں آئے، اس زمانہ میں شاعری کا جو انداز مقبولِ عام تھا سلطان حسین مرزا کے شعراء کا انداز تھا، چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا، اس لئے کسی نے ان کی قدر نہ کی، بلکہ ان کے کلام کو اس قدر لغو سمجھتے تھے کہ جب کسی کا کوئی مہمل شعر پڑھا جاتا تھا تو کہتے تھے فغانیہ[1] ہے، جامی اس وقت تک زندہ تھے، فغانی اُن سے ملے لیکن ان سے بھی فغانی کو داد نہ ملی، بالآخر تبریز میں آئے، یہاں سلطان یعقوب فرماں روا تھا، اس نے ان کی نہایت قدر دانی کی، چنانچہ انھوں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے، جو دیوان میں موجود ہیں، سلطان نے ان کو بابا کا خطاب[2] دیا،

---

[1] تذکرہ عرفات اوحدی [2] ایضاً،

سلطان یعقوب کے انتقال کے بعد ہیور د میں آکر قیام کیا،

نہایت لااُبالی مزاج اور رند تھے، شراب حد سے زیادہ پیتے تھے، اکثر میخانوں میں گذرتی تھی، اسی بنا پر ہیور د کے حاکم نے ان کا روزینہ شراب اور گوشت مقرر کر دیا تھا، اخیر عمر میں توبہ کی اور مشہد میں معتکف ہو گئے، ۹۲۵ھ ہجری میں وفات پائی،

شروع میں جب اپنے بھائی کی دکان میں چھری بنایا کرتے تھے تو اس مناسبت سے سکا کی تخلص[۱] رکھا تھا، پھر فغانی رکھا،

ان کا دیوان ایک لڑائی کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا، بھائی کو خط لکھا کہ جہاں کہیں سے جو کچھ مل سکے جمع کرو، چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے وہ مجموعہ مرتب ہوا جو آج موجود ہے، لیکن اصل مرتب شدہ دیوان جاتا رہا،

کلام پر رائے | ان کو تمام اہل سخن مجدد فن مانتے ہیں، والہ داغستانی لکھتے ہیں:

بابائے مغفور مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش از دے احدی بآں روش شعر نہ گفتہ و پایۂ سخنوری را بجائے رسانیدہ کہ عنقائے اندیشہ پیرامون او نمی تواند پرید' اکثر استادانِ زباں مولانا وحشی یزدی و مولانا نظیری نیشاپوری و مولانا ضمیری اصفہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولانا عرفی شیرازی و حکیم شفائی اصفہانی و حکیم سحار کنائے کاشی و مولانا محتشم وغیرہم متتبع و مقلد و شاگرد و خوشہ چین خرمن طرز روشِ اویند"

متاخرین کی جو خصوصیتیں ہیں، اُن کو ہم تمہید میں لکھ چکے ہیں، فغانی کے کلام میں وہ خصوصیتیں متوسط حد تک موجود ہیں، ورنہ اصلی ترقی عرفی، نظیری، شرف قزوینی وغیرہ نے دی ہے، ہم صرف کلام کے نمونے پر اکتفا کرتے ہیں،

---

[۱] عرفات اوحدی،

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ای کہ می گوئی چرا جامے بجانے می خری — ایں سخن با ساقیِ ما گو کہ ارزاں کردہ است

طرزِ ادا کا لطف دیکھو، معترض کو یہ اعتراض تھا کہ شراب ایسی کیا چیز ہے جو جان کے عوض میں خریدی جائے، لیکن اس نے اختصار کے لئے صرف اس قدر کہا کہ تم ایک پیالہ جان کے عوض میں کیوں خریدتے ہو، مے خوار شراب کے لطف کا اس قدر گرویدہ ہے کہ وہ یہ سمجھا کہ اعتراض اس پر ہے کہ شراب اتنی ارزاں کیوں خریدتے ہو، اس کی قیمت تو جان سے بڑھ کر کوئی چیز دینی چاہئے، اس کا جواب دیتا ہے کہ میں کیا کروں، یہ اعتراض تو ساقی پر کرنا چاہئے، اُس نے قیمت گھٹا کیوں دی،

بد گفتنِ من شد ہنرِ حاسد منکر — صد شکر کہ عیبم ہنرِ بے ہمزان است

خراب آں کمرِ نازکم کہ چوں مہ نو — بہ شیوہ ہائے بلند از میان زیں پیداست

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد — ایں بیخودی گناہ دل زود دستِ ماست

آں کہ ایں نامۂ سربستہ بنشت است نخست — گرہے سخت بسر رشتۂ مضموں زدہ است

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عینِ اوست — اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

بروں خرام کہ بسیار شیخ و دانشمند — خراب آں شکنِ طرہ و بنا گوشند

مقصود صحبت است زگل ورنہ بوی گل — انصاف اگر بود ز صبا می تواں شنید

آلودۂ شراب قناعی بہ خاک رفت — آہ از ملائکش کفنِ تازہ بو کنند

تا می تواں شکست دلِ دوستاں مخواہ — کیں خانہ را بکعبہ مقابل نہادہ اند

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر — زیں رسمہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند

با آہ و نالہ گرچہ سر آمد زمانِ وصل — از نقدِ عمر آں دو نفس در حساب بود

هزاراں چارہ ضائع گشت و یک دم نشد ساکن — کنوں دردِ دگر از پہلوے ہر چارہ دارم

تو ای گل بعد ازیں با ہر کہ می خواہد دلت بنشیں — کہ من چوں لالہ با داغِ جفایت زیں چمن رفتم

دلے می باید و صبرے کہ آرد تابِ دیدارش — فغانی گر دلے داری تو باش ایں جا کہ من رفتم

از فریبِ نقش، نتواں خانۂ نقاش دید — ورنہ در ایں سقفِ رنگیں جز یکے در کار نیست

ملک الشعرا فیضی

(تولد ۹۵۴ھ ہجری، وفات ۱۰ صفر ۱۰۰۴ ہجری)

فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے، جن کو اہلِ زبان کو بھی چارہ ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی، میرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں، اور مقطع میں کہتے ہیں،

این آن غزل کہ فیضیٔ شیریں کلام گفت — در دیدہ ام خلیدۂ در دل نشستۂ

علی نقی کمرہ، ایران کے مشہور شاعر نے ایک قصیدہ ۳۵ شعروں کا فیضی کی مدح میں اصفہان سے لکھ کر بھیجا، جس کے چند شعر یہ ہیں[1]:

مرا افگند بر نظم امورم پرتوِ فیضی — ابوالفیض آں گزینِ اکبر و شیخ کبیرِ من

اگر ہستم مجیر اندر سخن اوہست خاقانی — دگر من مستجیرِ آستانِ او مجیرِ من

یکیم با او رسد در شاعری دعوائے ہمچشمی — کہ در ایں خانقاہم من مریدو اوست پیرِ من

افسوس یہ ہے کہ شاعری کی شہرت نے فیضی کے اور تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا، وہ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے،

امروز نہ شاعرم حکیمم — دانندۂ حادث و قدیم

لیکن شاعری کی شہرتِ عام اور تصنیفاتِ علمی کی گم شدگی نے اس دعوی کو

[1] سرو آزاد،

بے دلیل کر دیا فیضی کے مذہبی اور علمی خیالات کا برلے نام کچھ پتہ چلتا ہے، تو ان اتہامات سے جو بدایونی نے نہایت بے دردی سے اس پر لگائے ہیں، تاہم ایک نکتہ داں کو اس غلط اور جھوٹی تصویر میں بھی اصلیت کے خط و خال نظر آتے ہیں، لیکن ابھی ان بحثوں کے چھیڑنے کا موقع نہیں، ابھی اس کے سرسری حالاتِ زندگی سننے چاہئیں،

فیضی عربی النسل ہے، اسلاف یمن میں رہتے تھے، شیخ موسیٰ جو فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں، وطن سے ترکِ تعلق کر کے سیاحت کو اٹھے، اور چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے، ریل ایک قصبہ ہے، یہاں قیام کیا، اور شادی کر لی، دسویں صدی ہجری میں خضر فیضی کے دادا وطن چھوڑ کر ناگور میں آئے، یہاں ایک عربی خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے فیضی اسی نخلِ کمال کا نونہال تھا، شیخ مبارک بڑے پایہ کا شخص تھا، علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتا تھا، چار جلدوں میں تفسیر کبیر کے انداز پر ایک تفسیر لکھی، جس کا نام منبع العیون رکھا، نہایت سیر چشم اور قانع تھا، شیر شاہی حکومت میں سلطنت کی طرف سے جاہ و عزت کی ترغیبیں دلائی گئیں لیکن اسکی چشمِ استغنا نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا، مفصل حالات ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھے ہیں،

شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے، جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا، اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی، خدا نے کثرت سے اولاد دی، جس میں سب سے پہلا فیضی تھا جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا، فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے حاصل کی،

بدایونی نے خواجہ حسین مروی کے حال میں لکھا ہے کہ فیضی اُس کا تربیت یافتہ تھا، خواجہ حسین مروی، شیخ علاء الدولہ سمنانی کے خاندان سے تھے، معقولات میں ملا عصام الدین

کے شاگرد تھے، دینیات شیخ ابن حجر مکی سے حاصل کی تھی، شاعری، انشا پردازی، حسنِ تقریر اور ظرافت و لطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم میں کرنا شروع کیا تھا، ۹۷۹ھ ہجری میں وفات پائی، فیضی نے دام ظلہٗ سے مادۂ تاریخ نکالا،

بدایونی نے یہ نہیں لکھا کہ فیضی نے کس فن میں ان سے تربیت پائی تھی، لیکن غالباً یہ شاعری کا فن ہوگا، شباب کو پہنچا تو اس کا دامن کمالات کے پھولوں سے بھرا تھا، لیکن قسمت نے مدتوں عجیب عجیب مصیبتوں میں مبتلا رکھا، جس کی داستان نہایت لمبی ہے لیکن چونکہ دلچسپ بھی ہے، اس لئے بالکل قلم انداز بھی نہیں کر سکتا،

شیخ مبارک کو وسعتِ نظر اور ہمہ داں ہونے نے تقلید اور تعصب کی بندشوں سے آزاد کر دیا تھا، خود حنفی تھا، لیکن شیعی، سنی، مسلمان کافر سب سے ملتا تھا، اس زمانے میں مہدوی فرقہ نہایت مطعونِ خلائق تھا، شیخ کو ان سے ملنے بھی دریغ نہ تھا، عوام میں شہرت پھیلی کہ شیخ رافضی ہے، مہدوی ہے، دہری ہے، سوے اتفاق یہ کہ اسی زمانے یعنی ۹۷۷ھ ہجری میں کہ اکبر کی سلطنت کا چودھواں[1] برس تھا شیخ گوشۂ عزلت سے نکل کر افادۂ عام کی مسند پر بیٹھا، اکبر اس زمانے تک متعصب مولویوں کے قبضہ میں تھا، اس کے بل پر درباریوں کو شیخ کے ستانے کا موقع ملا، ان میں سے ایک شخص آدھی رات کے وقت ہانپتا کانپتا فیضی کے پاس آیا، کہ امرائے دولت سب کے سب آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں، مصلحت یہ ہے کہ شیخ کو لیکر کہیں نکل جائیے، جب یہ فتنہ فرو ہو جائے تو پھر اختیار ہے، فیضی گھبرایا ہوا باپ کے پاس آیا، شیخ مبارک نے بڑے استقلال سے جواب دیا کہ میں جگہ سے نہیں

[1] آئین اکبری میں یہی سنہ ہے، لیکن تعجب ہے کہ خود ابو الفضل نے اکبرنامہ میں فیضی کے اول مرتبہ دربار میں پہونچنے کو بارہویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے،

ہلتا، جو ہونا ہے ہو گا، فیضی اس قدر حواس باختہ تھا کہ تلوار نکال کر کہا آپ کو اختیار ہے، چلئے یا نہ چلئے میں تو اپنے آپ کو ہلاک کئے ڈالتا ہوں،

باپ کو محبت نے مجبور کیا، ابو الفضل کو سوتے سے جگایا، تینوں باپ بیٹے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، لیکن کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں، چلتے چلتے فیضی کو ایک آشنا کا خیال آیا، اس کے گھر پہنچے، وہ ان لوگوں کو دیکھ کر سخت گھبرایا، مکان کے اندر گئے تو وحشت کدہ دیکھا، وہاں سے بھی چل کھڑے ہوئے، ابو الفضل نے واپس چلنے کی رائے دی، لیکن فیضی نے نہ مانا، ایک شخص کا نام لیا کہ اس کے ہاں ضرور امن ملے گا، غرض اس کے گھر پہنچے، اس نے نہایت گرمجوشی کا اظہار کیا، دو دن یہاں ٹھہرے، ادھر مخالفوں نے اکبر کو برہم کر کے فرمان شاہی صادر کرایا تھا، کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر کیا جائے، شاہی چوبدار شیخ مبارک کے گھر پہنچے، اور چاروں طرف پہرے بیٹھ گئے[1]، ابو الخیر فیضی کا چھوٹا بھائی گھر میں تھا، اسکو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لے گئے، شیخ کے دشمنوں کو اکبر کے بھڑکانے کا موقع ملا کہ شیخ کے دل میں چور نہ ہوتا تو روپوش کیوں ہو جاتا، اکبر کو مخالفوں کی سختی اور جوشِ انتقام دیکھ کر رحم آیا، درباریوں سے کہا، ایک غریب گوشہ نشین کی جان کا دشمن بننا کیا ضرور ہے، شیخ اکثر سیر کو نکل جاتا ہے، اس وقت بھی کہیں چلا گیا ہو گا، اس بیچارے لڑکے (ابو الخیر) کو کیوں پکڑ لائے ہو، غرض ابو الخیر چھوڑ دیا گیا، اور پہرا بھی اٹھ گیا،

دشمنوں نے اب بادشاہ کی زبان سے جھوٹی خبریں مشہور کرنی شروع کیں، کہ شیخ مبارک اور فیضی معتوبانِ بارگاہ ہیں، چند روز کے بعد صاحب خانہ نے بے اعتنائی شروع کی، شیخ کو کھٹکا ہوا، کہ خود صاحب خانہ کہیں پکڑوا دے، رات کو بے سر و سامانی کے ساتھ

---

[1] اکبر نامہ میں اس واقعہ کی تاریخ ۲۰ ربیع الاول ۹۷۴ھ ہجری بیان کی ہے،

وہاں سے نکلے، اتفاق سے ایک شاگرد راہ میں مل گیا، اس نے لے جاکر مہمان رکھا، لیکن اسکی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا، بالآخر یہ رائے ٹھہری کہ اس شہر سے نکل جانا چاہیئے، فیضی بھیس بدل کر نکلا اور ایک امیر کے پاس جس سے قدیم ملاقات تھی گیا، اس نے میزبانی کو اپنا فخر سمجھا، کچھ ترک جوان ساتھ کر دیئے کہ شیخ کو ساتھ لائیں، آدھے بیچ فیضی نے جاکر باپ بھائی کو یہ مژدہ سنایا، سب نے بھیس بدلے اور غیر معروف راستوں سے امیر کے پاس پہنچے، دس دن تک یہاں اطمینان سے گذرے لیکن دشمنوں نے امیر کو دربار میں پکڑوا بلوایا، مجبوراً یہاں سے بھی نکلنا پڑا، چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا، ٹھہر گئے کہ ذرا آرام لے لیں، بدقسمتی سے جاسوسوں کا ایک گروہ جو شیخ کی تلاش میں ہر طرف پھرتا تھا، باغ کے پاس اترا ہوا تھا، یہاں سے بھی گھبرا کر نکلے، راستہ میں ایک باغبان نے پہچانا، اور دلدہی کر کے اپنے گھر لے گیا، باغبان کا آقا باہر سے آیا تو اس نے شیخ سے شکایت کی کہ میرے ہوتے آپ نے کیوں اس قدر تکلیف اٹھائی، چونکہ شیخ کے قیافے سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی تھی، اس نے چور گھر میں لے جاکر رکھا کہ آپ اطمینان سے رہیئے، مہینے سے کچھ اوپر یہاں قیام کیا،

چونکہ اکبر اس زمانے میں فتحپور میں رہتا تھا، فیضی آگرہ سے فتحپور گیا کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نکالے، لیکن قسمت کی گردش یہاں بھی ساتھ تھی فیضی نے جب اپنی مظلومی کی داستان سنائی، تو درباریوں میں سے ایک نیک دل امیر کو اس قدر جوش آیا کہ اسی وقت اٹھا اور دربار میں بغیر اس کے کہ شاہی آداب بجالائے، گستاخانہ لہجے میں کہا، کہ اس ظلم کی کچھ انتہا ہے، اکبر نے کہا خیر ہے؟ امیر نے کیفیت بیان کی، اکبر نے کہا تم کو خبر بھی ہے؟ تمام علما نے فتوے تیار کئے ہیں، اور مجھ کو چین لینے نہیں دیتے کہ جہاں سے ہو شیخ مبارک کا خاندان ڈھونڈھ کر پیدا کیا جائے، اور اس کو سزا دیجائے، مجھ کو شیخ کا قیام گاہ معلوم ہے

دیہ کہہ کر اکبر نے خاص چوری کا پتہ دیا، جہاں شیخ کا قیام تھا) لیکن دانستہ ٹالتا ہوں، کل کوئی جا کر شیخ کو دربار میں لائے،

فیضی یہ واقعہ سن کر سخت گھبرایا، راتوں رات گرتا پڑتا باپ کے پاس آیا اسی وقت سب نے بھیس بدلے اور گھر سے نکلے، جس مصیبت اور پریشانی میں گھر سے نکلے ہیں اس کی تصویر ابو الفضل نے ان لفظوں میں کھینچی ہے:

"نورستان آفتاب وتاریک ہائے بدگوہر، و ہجوم مسالک شہر، و ہنگامہ پژوہندگانِ نافرجام، و یادرنا پدید، و بار انداز از نایافت، قلم چوبیں راچہ یارا کہ قدرے ازاں حال گزارد" نزدور

غرض ایک ویرانے میں جا کر پناہ لی، چونکہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ اپنی ذات سے مہربان ہے، اس لئے یہ رائے ٹھہری کہ پایۂ تخت میں چل کر بادشاہ تک رسائی کے سامان پیدا کئے جائیں، ایک امیر سے پرانی ملاقات تھی، اس کے پاس گئے، اس نے کہا کہ پہلے آتے تو معاملہ آسان تھا، اب حضور کے دل میں بھی رنج آگیا ہے، یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں، یہ کہہ کر گاڑی منگوائی اور اس میں بٹھا کر ایک گاؤں میں بھجوا دیا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گاؤں کا رئیس اس خاندان کا قدیمی دشمن ہے، غرض یہاں سے بھی نکلے، اور ایک اور گاؤں میں پہنچے،

یہاں بھی ایک مفسد کا سامنا ہوا، اب پھر پھرا کر آگرے میں آئے، اور ایک دوست کے گھر ٹھہرے، دو مہینے تک یہاں قیام رہا، صاحب خانہ نیک دل اور نیک طینت تھا، اور چند لوگ بھی شیخ کے طرفدار پیدا ہو گئے، دربار شاہی میں تقریب ہوئی (۹۷۴ہجری ۱۲جلوس) میں اکبر نے بڑے احترام سے بلایا، ابو الفضل کی طبیعت میں اس وقت تک نہایت آزادی

اور بے پروائی تھی، اُس نے دربار میں جانے سے انکار کیا، **فیضی** گئے اور شاہانہ نوازش سے بہرہ یاب آئے[1]، آئینِ اکبری میں اس موقع پر پہنچکر ابوالفضل پر شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اور بے اختیار یہ رباعی اس کی زبان سے نکلتی ہے،

ای شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش — رازِ دلِ من چناں مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم — ہاں ای شبِ وصل آں چناں باش کہ دوش

فیضی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے، شہنشاہ نے جس طرح اسکی قدرافزائی کی ہے، حاسدوں نے جس نگاہِ رشک سے اس کو دیکھا ہے، دربار کی جو خدمتیں اُسکو سپرد ہوئی ہیں، ان سب حالات کو **فیضی** نے ایک قصیدے میں لکھا ہے، ہم اس کے جستہ جستہ اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی — رسید، ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
بمژدانِ سعادت ندا کناں، کہ بخواں — بخات نامۂ خود ای حزین زندانی
مرا نظارہ اش از دور، بیقراری داد — چہ بے قراری با صد قرار ارزانی
بہ بوسہ کردم پایش نگار ازاں غافل — کہ کار گردد دشوار در قدم رانی
شدم سوار بسبک گام تو سنے چالاک — کہ کردی از سرِ دانش سپہر جولانی
خبر ببار گہ شہریار شد کاینک — رسید بر در فردوس مرغِ بستانی
خطاب شد کہ تلطف کناں رسانندش — بہ آسمانِ سعادت زنیتہ ظلمانی

[1] یہ تمام تفصیل آئین اکبری میں ہے، تعجب یہ ہے کہ ابوالفضل نے فیضی کے پہلی مرتبہ دربار میں پہنچنے کے تذکرہ میں ان واقعات کو لکھا ہے، لیکن اس قدر اختصار کیا ہے کہ واقعہ کی صورت بدل گئی ہے، اور بعض بعض بات میں دونوں بیان مختلف اور متناقض معلوم ہوتے ہیں،

نخست بوسہ زدم خاکِ آستاں یعنی
بہ چشمہ سار رساندم شفاہ عطشانی

اشارہ رفت کہ در پیش گاہ مجلسِ اُنس
شگفتہ دل بنشینی و شوق بنشانی

بہ پیش پایۂ اورنگ بنشستم
زبانِ ناطقہ لب ریز در ثنا خوانی

بگونہ گونہ تفقد شہنشہم بنواخت
کہ پایہ پایہ فرود آمدم ز حیرانی

حدیثِ من بشہنشاہ بندہ پرور بود
چو با خدائے، کلامِ کلیم عمرانی

بگفت خیز و علم از قلم بکش کایں روز
مسلّم است ترا کشورِ سخن رانی

زبان بنکتہ بجنباں کہ در بدائعِ نظم
فرزدقی بتوازانی ست و حسّانی

رسید حکم کہ از نکتہ سنجی شعرا
بہ عرضِ ما برساں آں قدر کہ بتوانی

زبان وری کہ دگر با تو در سخن پیچد
سزد بدستِ ادب گردنش بپیچانی

چہ گویم آں کہ بلطفش چہ طرف بربستم
ز ہر چہ لازمہ خانی است و ترخانی

یہ تمام داستان (قصیدہ کو چھوڑ کر) ابوالفضل (ایک لقب ہے) نے آئین اکبری کے خاتمہ میں لکھی ہے لیکن اس تصریح کو دانستہ قلم انداز کر گیا کہ شیخ کے خاندان پر یہ تمام آفتیں کس کی بدولت آئیں؟ اور دربار کے تقرب کا سبب کون ہوا؟ اس کے علاوہ ابوالفضل کے بیان سے یہ بھی نہیں کھلتا کہ اس قدر مخالفت اور کینہ پروری کے اسباب کیا تھے؟ اس لئے ان ابہامات کی تفصیل ذیل میں کیجاتی ہے،

اکبر کے ابتدائی دور میں دو شخص مذہبی حیثیت سے نہایت جاہ و اقتدار رکھتے تھے، مخدوم الملک، اور شیخ عبد النبی، مخدوم الملک کا نام عبد اللہ انصاری ہے، شیر شاہ نے اپنے عہدِ سلطنت میں ان کو صدر الاسلام کا خطاب دیا تھا، سلیم شاہ ان کو اپنے تخت پر بٹھاتا تھا، ہمایوں نے "شیخ الاسلام" کا خطاب دیا تھا، بیرم خاں نے

روپیے سالانہ تنخواہ مقرر کی تھی[1]،

شیخ عبدالنبی جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے نواسے تھے، صدارت پر ممتاز تھے، یعنی جس قدر مذہبی اوقاف اور جاگیریں تھیں، سب کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا، اُنھوں نے اکبر کو اس قدر گرویدہ کیا تھا کہ اکبر ان کے گھر جاکر ان سے حدیث پڑھتا تھا، ان کے فیضِ صحبت سے اکبر کی مذہبی خودرفتگی کی یہ نوبت پہونچی کہ اپنے ہاتھ سے مسجد میں جھاڑو دیتا تھا،

ایک دفعہ سالگرہ کی تقریب میں اکبر نے کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبدالنبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ لکڑی اُٹھاکر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر مریم مکانی (اکبر کی والدہ) سے شکایت کی کہ بھرے دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا کہ بیٹا دل پر میل نہ لانا یہ نجاتِ اخروی کا سبب ہے قیامت تک چرچا رہیگا کہ ایک مفلوک الحال نے بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا اور اس نے برداشت کیا[2]،

یہ دونوں بزرگ جس قدر دیندار تھے، اسی قدر جاہلانہ تعصب رکھتے تھے، جیسا کہ عام طور پر دینداری کا مقتضا سمجھا جاتا ہے، ان لوگوں نے اکبر کو آمادہ کیا کہ ملک میں جو بدعقیدہ لوگ ہیں، ان کا استیصال کر دیا جائے، چنانچہ عام دار وگیر شروع ہوئی، اور بہت سے لوگ قتل اور قید کئے گئے، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی نے اکبر سے کہا کہ شیخ مبارک بھی بدعتی ہے، اس کو سزا ملنی چاہئے، چنانچہ اُسی وقت محتسب متعین

---

[1] مآثر الامرا، تذکرۂ مخدوم الملک۔ [2] مآثر الامرا جلد دوم، صفحہ ۵۶۰ حالات شیخ عبدالنبی، صدر الاسلام۔

ہوئے کہ شیخ کو پکڑ لائیں، شیخ گھر میں نہ تھا، اس کی مسجد کا منبر توڑ کر چلے آئے[۵۱]،

ایک دفعہ ایک مجلس میں شیخ عبد النبی، یا مخدوم الملک (ابو الفضل نے آئین اکبری میں صاف نام نہیں لیا، بلکہ لکھا ہے کہ سرآمد فتنہ جویاں) سے اس قسم کی سختیوں کے متعلق ابو الفضل سے بحث ہو گئی، ابو الفضل نے دلائل سے ان کو بند کر دیا،

اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ پہلے فیضی شیخ مبارک کو ساتھ لے کر شیخ عبد النبی کے پاس گیا، اور اپنی شکستہ حالی کا اظہار کر کے کچھ مدد معاش کی درخواست کی، شیخ نے شیعیت کا الزام لگا کر، نہایت ذلت کے ساتھ نکلوا دیا[۵۲]،

اب یہ دونوں بزرگ اس خاندان کے استیصال پر آمادہ ہوئے، علما سے فتوے لے جا کر جاسوس متعین کئے کہ شیخ کو ڈھونڈھ لائیں، تمام ملک میں مشہور کرا دیا کہ شیخ کے خاندان کے لئے دربار سے قتل کا حکم ہو چکا ہے، شیخ نے پہلے شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں التجا کی کہ میری جان بچائیے، شیخ سلیم نے کچھ زاد راہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ سر دست مصلحت یہی ہے کہ کہیں نکل جائیے، یہاں سے ناامیدی ہوئی تو میرزا عزیز کے پاس گیا[۵۳]، میرزا عزیز کی ماں کا دودھ اکبر نے پیا تھا، اس لئے وہ اکبر کی خدمت میں نہایت گستاخ تھا، ابو الفضل نے آئین اکبری میں جو لکھا ہے کہ ایک امیر نے اکبر کے سامنے نہایت گستاخانہ سفارش کی، اس سے مرزا عزیز ہی مراد ہے، مرزا عزیز نے بارہا اکبر کو سر دربار سخت سست کہا اور اکبر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا تھا کہ کیا کروں میرے اور عزیز مرزا کے بیچ میں دودھ کا دریا حائل ہے، (دودھ بھائی ہونے کا یہ پاس ہوتا تھا) میرزا عزیز ہی کے توسل سے فیضی کے

---

۵۱ بدایونی، صفحہ ۱۹۸،

۵۲ مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۵۷۵ و ۵۷۶ ۵۳ بدایونی ص ۱۹۹،

خاندان کو دربار میں رسائی ہوئی،

اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آچکا تھا، اور ان لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا، لیکن خود جاہل تھا، اس لئے مذہبی فتووں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، فیضی اور ابوالفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا دو زار ہاتھ آگئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان متعصبوں کو شکستیں دیں، اور ان کا سارا بھرم کھل گیا، چنانچہ تفصیل اسکی آگے آئے گی،

فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا، لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہیں کی، طبیب تھا، مصنف تھا، شاعر تھا، اور انہی مشغلوں میں بسر کرتا تھا، شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۲۴ سنہ جلوس میں شہزادۂ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اس کو ضروری مراتب سکھا دئے[1]، جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ شہزادۂ دانیال ہندی (برج بھاکا) کی شاعری سے واقف تھا اور خود بھی کہتا تھا، یہ فیضی ہی کی صحبت کا اثر ہوگا، اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے مسجد میں جاکر خطبہ پڑھا، یہ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، چنانچہ تفصیل اسکی آگے آئے گی،

۲۵ سنہ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لئے شہزادۂ دانیال کو اجمیر کی زیارت کے لئے بھیجا تو فیضی کو بھی اس کے ساتھ متعین کیا،

اکبر نے شیخ عبدالنبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دئے تھے، چنانچہ ۹۰۹ھ میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی، ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں

---

[1] اکبر نامہ نولکشوری، صفحہ ۲۲۵، جلد سوم،

پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا،

۹۹۶ھ ہجری میں جو اکبر کی تخت نشینی کا تینتیسواں سال تھا فیضی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا، عجیب اتفاق یہ کہ اس سے دو ہی تین دن پہلے فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا،

آں روز کہ فیض عام کردند　　　ما را ملک الکلام کردند

از بہرِ صعود فکرتِ من　　　آرائشِ ہفت بام کردند

ما را بہ تمام در ربودند　　　تا کارِ سخن تمام کردند

۹۹۷ھ ہجری میں اکبر نے کشمیر کا سفر کیا تو فیضی بھی ساتھ تھا، قصیدۂ کشمیریہ اسی سفر میں لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر　　　کہ بارِ عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

دکن کی حکومتوں کو جب اکبر نے فتح کرنا چاہا، تو ۳۶ھ جلوس مطابق ۹۹۹ھ ہجری میں پہلے ایک ایک کے پاس سفارتیں بھیجیں خاندیس کی سلطنت کا فرمانروا راجہ علیخاں تھا فیضی کو اس کی سفارت پر متعین کیا، فیضی کو اگرچہ یہ خدمت ناگوار تھی، لیکن قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، اس نے سفارت کے معاملات اس خوبی سے انجام دیئے کہ راجہ علی خاں نے حلقہ بگوش بن کر آنے کی اطلاع دی، فیضی نے برہان پور میں دربار آراستہ کیا، تخت پر شاہی تلوار، خلعت اور فرمان شاہی رکھا گیا، راجہ علی خاں دور سے پیادہ ہوا، تخت کے قریب آکر جوتیاں اتاریں، کھڑے ہو کر تین تسلیمیں بجالایا، فیضی نے فرمان شاہی دونوں ہاتھوں میں ادب سے لے کر کہا کہ حضور نے تمھارے نام فرمان بھیجا ہے، راجہ علی خاں نے فرمان دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر پر رکھا اور تین تسلیمیں بجالایا، اسی طرح خلعت اور تلوار عطا کئے جانے پر تسلیمیں کیں، چنانچہ

فیضی نے اپنی عرضداشت میں یہ تمام امور تفصیل سے بیان کئے ہیں، یہاں کی مہم سے فارغ ہو کر احمد نگر میں برہان نظام شاہ سے ملا، اور سفارت کے مراتب انجام دیے، اس سفر میں اصلی خدمت اگرچہ سفارت کا انجام دینا تھا، لیکن فیضی نے ملک کی ایک ایک چیز پر مبصرانہ نظر ڈالی، اور بادشاہ کو عرضداشت میں مفصل رپورٹ بھیجی، مثلاً راستوں کا کیا انتظام ہے، عہدہ دار اپنی خدمتوں کو کیونکر انجام دیتے ہیں، شہروں میں رفاہ عام کی کیا کیا عمارتیں ہیں، قلعوں کی کیا حالت ہے، زمین کیسی ہے، پیداوار کیا ہے، پھل کیا کیا پیدا ہوتے ہیں، صنعت کے کارخانے کہاں کہاں ہیں، چنانچہ اس رپورٹ کے جستہ جستہ فقرے ہم درج کرتے ہیں،

بلوچی کہ بہ فوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگی کوہ درمیان لدھیانہ و سرہند چسپیدہ است، دزدانے کہ از کوہ فرود می آید، بہ او ہم حق نذری می دہند، یعقوب بدخشی خدمت فوجداری و علمداری تھانیر و پرگنات ہرود بواجبی می تواند کرد،

چوں بہ دھول پور رسید، سرائے دیہ از سنگ بغایت رفیع کہ صادق خاں ساختہ، و متصل آں حمام گرمے می باشد، و باغے دلکشا مشتمل بر عمارت دلکش پسرش رشید آں جا بود، سیر قلعۂ گوالیار نیز کردہ شد،

بھجاول پور خواجہ امین خویش وزیر خاں بہ رعایا سلوک خوب کردہ و تقاوی دادہ پرگنہ معمور ساختہ، کارخانہائے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ و فوطہ و دکنی لنگی، برائے حضرت می بافند، برہان پور و حوالی او اندک جائے است بغایت تنگ،

اکثرے بوستان، ہر جا قطعہ زمینے بودہ مزروع شدہ، از میوہ انجیر خوب می شود، خربزہ فرنگی بشاخ درخت بست وسی، سی خوشہ جنبان ست، خربزہ ہندوستانی ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ"

یہ تو خاص ہندوستان کے حالات تھے، غیر ملکوں کے بھی ہر قسم کے مفید اور ضروری اور قابلِ اعتنا حالات بہم پہنچائے، اور عرضداشتوں میں اکبر کو لکھے، مثلاً ایک عرضداشت میں لکھتا ہے،

اب کی چھ جہاز ہرمز سے چلے، خواجہ معنائے عمدۃ التجار، عراقی گھوڑے لے کر آرہا تھا، فرنگیوں کا قاعدہ ہے، کہ گھوڑے چھین لے جاتے ہیں، اور جو پسند آتا ہے رکھ لیتے ہیں، تین جہاز بندرگاہ چول میں سلامت آئے حسن قلی افشار اور حسین بیگ لشکر نویس جو صفویہ سلطنت کے عہدہ دار ہیں آستان بوسی کے ارادہ سے آتے ہیں، یہ لوگ اپنے حرم کو بھی ساتھ لاتے ہیں، شاہ عباس صفوی کا سن بیس برس کا ہے، تفنگ اندازی اور چوگاں بازی وغیرہ کا شیفتہ ہے، پارسال دو مرتبہ گھوڑے سے گرا، شجاعت اور بہادری اس کے حالات سے ظاہر ہے، ابھی تک کاروبار خود اپنے ہاتھ میں نہیں لئے، فرہاد خاں وکیل اور حاتم بیگ وزیر اعظم تمام کاموں کو انجام دیتے ہیں، پارسال عباس نے خراسان پر لشکر کشی کرنی چاہی تھی، ہرات پہونچ کر فوج میں طاعون پھیلا اسلئے واپس گیا"

اسی طرح ایران و روم کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، اور جن باتوں کو پالیٹکس سے تعلق ہے، ان کے ساتھ خاص اعتنا کرتا ہے، ان خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ وہ کس قدر ملکی معاملات کی تہ تک پہونچتا تھا،

اس عرضداشت میں ملک قمی اور ظہوری کی بھی تقریب اور نہایت تعریف کی ہے، اور ان کے عمدہ اشعار نقل کئے ہیں، ان کے علاوہ اور ہر فن کے ارباب کمال کا ذکر کیا ہے، بیچ بیچ میں دلچسپ اور لطیف حکایتیں بھی لکھتا جاتا ہے،

غرض ایک برس آٹھ مہینے چودہ دن ان اطراف میں رہا، اور سفارت کا کام نہایت خوبی سے انجام دے کر ۱۰۰۱ھ میں پائے تخت میں آیا،

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ فیضی کو ملکی معاملات میں کبھی سروکار نہیں پڑا تھا، وہ شاعر اور حکیم تھا، اور یہی اُس کا اصلی مذاق تھا، لیکن اُس زمانے میں تعلیم کے طریقے کی یہ خوبی تھی کہ ایک عالم کو جس قسم کی خدمت دیدیجائے اس کو انجام دے سکتا تھا، آج کل کا سا حال نہ تھا کہ مولوی اور عالم، مردہ شوئی اور جنازہ خوانی کے سوا، اور کسی کام نہیں آسکتے،

۳۹ سنہ جلوس میں اکبر نے اصرار کے ساتھ خواہش کی کہ نظامی کے خمسہ کا جواب لکھا جائے، اور نل دمن سے آغاز کیا جائے، چنانچہ فیضی نے نل دمن چار مہینے میں پوری کر کے پیش کی، تفصیل اس کی آگے آئے گی،

اسی زمانے میں فیضی کو دمہ کا عارضہ ہوا، اور بیماری کے آغاز میں یہ رباعی کہی[1]،

دیدی کہ فلک چہ زہرہ نیرنگی کرد — مرغِ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے در و می گنجید — تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

یہ شعر اکثر زبان پر رہتا تھا،

گر ہمہ عالم بہم آیند تنگ — بہ نہ شود پائے یکے مور لنگ

حکیم مصری اس زمانے کا نہایت مشہور معالج تھا، اس نے بڑی مستعدی سے علاج

[1] مآثر الامراء،

کیا، لیکن موت کا کیا علاج[1] تھا، مرنے سے دو دن پہلے غفلت طاری رہتی تھی، اکبر کو خبر ہوئی اسی وقت پہنچا، فیضی نے آنکھیں کھولیں، اور آداب بجا لایا، اکبر نے خدا کو سونپا اور اُٹھ کر چلا آیا[2]۔ ابوالفضل نے تیمارداری کے لئے بادشاہ سے چار دن کی رخصت لی، عین نزع کے وقت آدھی رات کو اکبر کو خبر ہوئی، بے قراری کی حالت میں آیا، اور فیضی کا سر ہاتھ میں لے کر دو تین دفعہ پکار کر کہا، شیخ جیو! (اکبر اسی لقب سے فیضی کو خطاب کیا کرتا تھا) میں حکیم علی کو علاج کے لئے لایا ہوں، آپ بولتے کیوں نہیں؟ شیخ نے جب کچھ جواب نہ دیا تو سر سے پگڑی اتار کر پھینک دی اور ابوالفضل کو تسلی دی کر چلا آیا[3]، صفر ۱۰۰۴ھ (۴۰ جلوس) ہجری میں انتقال کیا،

عام حالات اور اخلاق و عادات

فیضی پر اگرچہ بظاہر شاعری کا احسان ہے کہ آج اُس کو جو شہرت ہے، اسی نام سے ہے، لیکن حقیقت میں شاعری ہی نے اس کے تمام کمالات کو مٹا دیا، ملا عبدالقادر بدایونی سے بڑھ کر اس کا دشمن کون ہوگا تاہم اس کا تذکرہ ان لفظوں سے شروع کرتے ہیں:

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا عدیل در روزگار نہ داشت"

علوم متداولہ میں سے، اس کو فقہ، مناظرہ، سیاق اور تاریخ و محاضرات سے رغبت نہ تھی، چنانچہ ایک قطعہ میں خود لکھتا ہے:

آیا حریف دریں بزمگاہ فیضی را — گماں مبر کہ زخیلِ تہی سبویان ست
بکوہ و دشت معانی کہ مرغ پر نزند — بہ چابکی تعقل دو اسپہ پویان ست
گر مسائلِ فقہ مقلدانِ ہوا — کہ علم حیلہ گران و بہانہ جویان ست

---

[1] بدایونی حالات حکیم مصری [2] اکبر نامہ [3] بدایونی،

مشاجراتِ فرائض کہ کس نخواند ش | از و مپرس کہ او علم مردہ شویان ست
در خلاف و جدل ہم بخویشتن نکشود | کہ آں مقدمۂ جنگ تندخویان ست
سیاہ نامۂ اہلِ سباق ہم ننوشت | کہ کار تیرہ دروناں سخت پویان ست
مدار حرف بتاریخ ہم مدار کہ آں | فسانہائے ملال دروغ گویان ست

ایشیائی درباروں میں خوشامد اور تملق کے بغیر کوئی شخص فروغ نہیں پا سکتا، لیکن فیضی نے علم کی آبرو قائم رکھی، اس نے یہ گوارا کیا کہ باوجود اس قدر تقرب اور ہمنشینی کے اس کا منصب چار صدی سے نہ بڑھا، حالانکہ ابوالفضل اس کا چھوٹا بھائی دونیم ہزاری تھا، لیکن اوروں کی طرح اس نے عزتِ نفس کو برباد نہیں کیا، صاحب مآثر الامراء فیضی سے خوش نہیں، تاہم فرماتے ہیں،

"پیش آمد و مصاحبت شیخ درپیش گاہ خلافت بہ عنوان علم و کمال بود زیادہ بر چار صدی منصب نیافت"

کتب خانہ | شیخ کا اصلی مذاق، علم و فن کی خدمت تھی، کتابوں کا نہایت شائق تھا، ایک گراں بہا کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں ۴۶۰۰ کتابیں تھیں، اور اکثر خود مصنف کے ہاتھ کی یا ان کے زمانے کی لکھی ہوئی تھیں، یہ کتابیں تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل تھیں، طب و نجوم و موسیقی، حکمت و تصوف و ہیئت و ہندسہ، تفسیر و حدیث و فقہ وغیرہ[1]، دوستوں کو اکثر خطوط میں کتابوں کے بہم پہنچانے کی فرمایش کرتا ہے، ایک دوست کو لکھتا ہے:

"از کتب حکمت با قسامہا آنچہ بہم رسد بجہت فقیر بگیرند و بہر بہائے کہ باشد"

اجمیر میں ایک دفعہ کسی نے کہا کہ فلاں صاحب نے میر ہزارہ کے ہاتھ سعید ہروی کا

---

[1] کتب خانہ کے متعلق یہ تفصیل بدایونی نے فیضی کے تذکرہ میں لکھی ہے،

دیوان بھیجا ہے، فوراً ان کے گھر پہنچا، اور کتاب کا تقاضا کیا، امیر خسرو کے تغلق نامہ کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، لیکن اوّل و آخر سے ناقص تھا، ایک دوست کو لکھتا ہے،

"یکے از خدمتگاران امر فرمایند کہ بہر خطے مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند"

فیاضی | نہایت فیاض اور سخی تھا، اہلِ کمال کے لئے اس کا گھر مہمان سرائے عام تھا، عرفی ایران سے آیا تو اول اسی کا مہمان ہوا اور بہت دنوں تک اس کے گھر پر مقیم رہا، اس کی تفسیر کی تاریخ حیدر معمائی نے سورۂ قل ہو اللہ سے نکالی تو دس ہزار روپیے صلہ میں دئے[1]،

درویش پرستی | فقراء اور اہلِ دل کا نہایت گرویدہ تھا، اور اکثر بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوتا تھا، خواجہ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں خاص ارادت تھی، ان کے مزار پر جب گیا ہو تو کئی قطعے لکھے ہیں، ایک یہ ہے،

سفر گزیدہ ترین نعمتے ست در عالم — زبہر ذوقِ خدا دانی و خدا بینی
دریں سفر زپے طوفِ اولیائے عظام — کہ بودہ اند شہاں در لباسِ مسکینی
رسید بہرِ طوافِ مزارِ گنج شکر — کہ کردہ زیرِ سرش نہ سپہر بالینی
بلے چو خوانِ کرم اہلِ نعمت آرایند — بروے مائدۂ آخر کنند شیرینی

ایک اور قطعہ ہے،

قطبِ ربانی فریدالدین شکر گنج آنکہ خلق — درمقامِ او بہ صد رنج سفر پے بردہ اند

دو تین شعر کے بعد کہتا ہے:

---

[1] مآثر الامراء، ذکر فیضی

طوطیان دیدیم در پرواز گردِ مرقدش　　گوئی اینہا ہم بآں گنجِ شکر پے بردہ اند

ایک دوست کو لکھتا ہے:

"در احوال ذکر مشائخ ہند، انچہ داشتہ باشند، از ملفوظات وغیرہ ہمہ ہمراہ آرند، البتہ بدست عزیزے کتابے در احوال مشایخ ہند بود موسوم بہ تذکرۃ الاصفیا، اگر دراں شہر بہم رسد، بہم رسانند، کہ بسیار مطلوب ست"

رشک وحسد اور ناتواں بینی شعرا کا عام خاصہ ہے، لیکن فیضی تمام معاصرین کا نام نہایت عزت اور محبت سے لیتا ہے، اور دربار شاہی میں ان کی سفارش کرتا ہے، اکبر کو ایک عرضداشت میں لکھتا ہے:

"در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر رتبۂ عالی دارند، یکے ملک قمی کہ بہ کس کمتر اختلاط می کند، و ہمیشہ مژۂ تر ے دارد، دیگر ملاظہوری کہ بنایت رنگیں کلام ست، و در مکارمِ اخلاق تمام عزیمت آستاں بوس دارد،

دونوں کے اشعار بھی نقل کئے ہیں،

ملک قمی کا دیوان اوّل اوّل فیضی ہی دکن سے اپنے ساتھ لایا[1]، غزالی شاعر مرا تو اس کی تاریخ کہی،

قدوۂ نظم، غزالی کہ سخن　　ہمہ از طبعِ خداداد نوشت

عقل تاریخ وفاتش بدو طور　　سنہ نہ صد دہ ہشتاد و نوشت

۹۸۰ھ

عرفی کی نسبت عام طور پر یہ مشہور ہے کہ فیضی اس سے جلتا تھا، اور دونوں میں

---

[1] بدایونی، تذکرۂ ملک قمی،

ہمیشہ نوک جھوک رہتی تھی، چنانچہ اس قسم کے قصے، خافی خاں اور بدایونی نے بھی نقل کیے ہیں، لیکن فیضی کے مکاتیب موجود ہیں، اس میں ایک دوست کو خط لکھا ہے، اور عرفی کی اس قدر تعریف کی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی، ہم اُس کے خاص الفاظ عرفی کے حال میں نقل کریں گے،

نہایت حلیم اور نیک نفس تھا، ملا عبدالقادر بدایونی کا برتاؤ جو اس کے ساتھ تھا، اس کا اندازہ اُن الفاظ سے ہوسکتا ہے جو ملا صاحب نے اس کی نسبت استعمال کیے ہیں، چنانچہ اس کے حالات میں لکھتے ہیں:

"مخترع جد و ہزل و عجب و کبر و حقد و مجموعۂ نفاق و خباثت و ریا و حب جاہ، و خیلاء و رعونت بود، در وادی عناد و عداوت با اہل اسلام وطعن در اصل اصول دین و اہانت مذہب و مذمت صحابۂ کرام و تابعین و سلف و خلف متقدمین و متاخرین و مشائخ داموات و احیاء و بی ادبی و بے تحاشی نسبت بہمہ علما و صلحا و فضلا سرًّا و جہاراً لیلاً و نہاراً ہمہ یہود و نصاریٰ و ہنود و مجوس برو ہزار شرف داشتند"

لیکن فیضی کا سلوک ملا صاحب کے ساتھ یہ تھا، کہ ملا صاحب جب دربار اکبری سے معتوب ہوئے، تو ۹۹۹ھ ہجری میں اُس نے احمد نگر سے ایک خط اکبر کو لکھا، جس میں ملا صاحب کے کمالات کی بے انتہا تعریف کی، ان کے علمی اور اخلاقی کمالات آٹھ دس سطر میں گنائے ہیں، آخر میں لکھا ہے کہ گویا میں خود حضور کی درگاہ میں حاضر ہوکر نامبردہ کے اوصاف عرض کر رہا ہوں، اور نہ کرتا تو حق پوشی کا مجرم ہوتا، ملا صاحب کی غیرت کی داد دینی چاہئے کہ خود اس خط کو اپنی کتاب میں نقل بھی کیا ہے، اور چونکہ یہ کھٹکا بھی تھا کہ لوگ کیا

کہیں گے اس لئے فرماتے ہیں،

"اما چہ تواں کرد کہ حق دین و حفظ عہد آں بالاتر از ہمہ حقوق ست احب للہ والبغض للہ،

ملا صاحب اور اُن کے تمام پیرووں نے متفقاً فیضی کو ملحد، بیدین، زندیق اور کافر لکھا ہے، ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فیضی مرنے کے وقت کتوں کی طرح بھونکتا تھا اور اس کے ہونٹھ سیاہ ہو گئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فیضی کے رتبہ کو سمجھ نہیں سکتے تھے، وہ جو حکیمانہ خیالات ظاہر کرتا تھا، ان لوگوں کو الحاد اور زندقہ نظر آتا تھا فیضی کے مذہب اور اس کے خیالات سے اس کا دیوان بھرا پڑا ہے، اس کے پاکیزہ خیالات خود اُس کی زبان سے سنو،

ما طائر قدسیم نوا را نشناسیم — مرغِ ملکوتیم ہوا را نشناسیم
برہانِ ثبوتیم ز ما نفی نیاید — از ما نغم آموز کہ لا را نشناسیم
در کشفِ حقائق سبق آموز ضمیریم — ترتیب دلیلِ حکما را نشناسیم
با اہل جدل نکتہ توحید نہ گوئیم — در وحدتِ حق چون و چرا را نشناسیم
اصحابِ یقینیم، گماں را نہ پسندیم — ارباب صوابیم خطا را نشناسیم
از قافلۂ ما نتواں یافت نشانے — رقصِ جرس و بانگِ درا را نشناسیم
نور جبروتیم، ز ظلمت نہ ہراسیم — آئینہ صبحیم، شامِ مسا را نشناسیم
بر دانشِ ما انجم و افلاک بخندند — گر صاحب لولاک لما را نشناسیم
صد شکر کہ ما پیرو اصحابِ رسولیم — در شرع، دگر راہ نما را نشناسیم

اس کے بعد چاروں خلفا کے اوصاف بیان کئے ہیں،

بدایونی وغیرہ کہتے ہیں کہ فیضی فلسفہ کو شرع پر مقدم سمجھتا تھا، لیکن وہ خود مرکز ادوار میں لکھتا ہے:

معنی قرآن چہ ادا می کنی ۔۔۔ ایں ہمہ تاویل چہ را می کنی
حق ز تو با غیر متشابہ شدہ ۔۔۔ پیشِ تو محکم متشابہ شدہ
فہم تو از قولِ نبی اجنبی ۔۔۔ بے خبر از سرِ حدیثِ نبی
چوں سخن از شرح بہ حج می رود ۔۔۔ فکر تو چوں حاشیہ کج می رود
طعنہ مزن ایں ہمہ بر اختلاف ۔۔۔ کز پے تسہیل تو رفت اختلاف
گر بمیان در بہ طرف رفتہ اند ۔۔۔ راہ چناں رو کہ سلف رفتہ اند
بہر ریاضی بہ ریاضت مکوش ۔۔۔ نور الٰہی بہ طبیعی مپوش
از خطِ اقلیدس دستخطش مگوی ۔۔۔ تختہ اشکال مجسطی بشوی
بگذر از یں علم و عمل پیش گیر ۔۔۔ ترک قوانین جدل پیش گیر

بایں ہمہ وہ فراخ مشرب اور آزاد خیال تھا، اور جانتا تھا کہ متعصب مولویوں نے مذہب کی جو صورت بنا رکھی ہے، یہ اسلام کی اصلی تصویر نہیں، شیعہ سنی کے جھگڑوں کو وہ اصل مذہب سے غیر متعلق سمجھتا تھا، اور ان خانہ جنگیوں کی ہنسی اڑاتا تھا، اکبر کی ایک عرضداشت میں لکھتا ہے کہ، ایک اوذبک ترک ہاتھ میں دھاگا لئے پھرتا تھا، لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بولا کہ میری ماں نے دیا ہے کہ کسی رافضی کے خون سے رنگین کرلا، تو میں رکھ چھوڑوں کہ میرے کفن کے سینے میں کام آئے، اسی عرضداشت میں لکھتا ہے، کہ چند احباب ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص نے کہا کہ اسی طرح حوضِ کوثر کے چاروں کونے پر خلفاے اربعہ تشریف رکھتے ہوں گے، اور مومنیں کو

آپ کوثر پلاتے ہوں گے، ایک شیعہ جس کا نام محمود صباغ تھا، بولا کہ کیا فضول بکتے ہو، حوض کوثر دور ہے اور اس کے ساقی مرتضیٰ علی ہیں، یہ کہہ کر بھاگا، یہ حکایتیں لکھ کر فیضی حضرت خواجہ فرید الدین عطار کے یہ اشعار نقل کرتا ہے،

زنادانی دل پُر جہل و پُر مکر — گرفتار علی ماندی و بوبکر

چو یک دم زین تخیل می نرستی — نمی دانم خدا را کے پرستی

فیضی پر بڑا الزام یہ ہے کہ اس نے اکبر کو لامذہب اور ملحد بنا دیا، اس جھوٹ میں صرف اس قدر سچ ہے کہ ایک زمانے میں شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک نے اس قدر تعصب پھیلا دیا تھا کہ غیر مذہب کے لوگ علانیہ قتل اور گرفتار کیے جاتے تھے، خود بدایونی کی کتاب میں متعدد واقعات ہیں کہ بہت سے لوگ بدعتی اور رافضی ہونے کے جرم میں قتل کر دیئے گئے، فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کی اس تنگ خیالی کی اصلاح کی لیکن عبد النبی اور مخدوم الملک کا اثر ملک پر اس قدر غالب آچکا تھا، کہ ان کا زور توڑنا مشکل تھا، فیضی اور ابوالفضل نے علمی مجلسیں قائم کرائیں جن میں درباریوں کو علانیہ نظر آیا کہ ان متعصبوں کے پاس لعن اور تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں، اس کے بعد سنہ ۹۸۷ (۲۴ جلوس) ہجری میں ایک محضر نامہ طیار کرایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے، اس کو یہ منصب حاصل ہے کہ مسائلِ مختلفہ میں جس مجتہد کے قول کو چاہے اختیار کرے، اور وہی حجت ہوگا" اس محضر کی عبارت شیخ مبارک نے لکھی، اور فیضی اور ابوالفضل نے اُس پر دستخط کیے، لطف یہ کہ شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک کو بھی دستخط کرنے پڑے، اکبر نے یہ بھی چاہا کہ اعلانِ عام کی غرض سے جمعہ کی نماز بھی پڑھائے، تاکہ منصب امامت مسلم ہو جائے، فیضی نے خطبہ لکھدیا،

بنام آن که مارا سروری داد | دے دانا و بازوے قوی داد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر | تعالے شانہ، اللہ اکبر

ان کارروائیوں نے متعصب مولوں کا زور توڑ دیا، اور اکبر کو موقع ملا کہ وہ ایک ایسی وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے، جس کے سایہ میں ہندو مسلمان، یہود و نصاریٰ سب آزادی کے ساتھ اپنے اپنے فرائضِ مذہبی ادا کرسکیں، اور یہی طرز حکومت خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا،

اس میں شبہہ نہیں کہ اکبر اس عالم میں حد سے تجاوز کر گیا تھا، درباریوں نے اس کو بنانا شروع کیا، اور وہ بنتا گیا، وسعت مشرب میں اُس نے آتش پرستی اور آفتاب پرستی تک کی، لیکن اس میں فیضی کا کیا قصور ہے فیضی سے جہانتک ہو سکا اس نے ہر موقع پر مذہبی پہلو قائم رکھا، یاد ہوگا جب اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے توریت کا ترجمہ سنانا شروع کیا اور یہ مصرع پڑھا،

ع اے نامی ژژ د کرسٹو (جیزس کرائسٹ)

تو فیضی برابر سے بولا ع سُبحانک لا سواک یا ہو،

فیضی نے تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے، لیکن ایک ذرہ مسلمات عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اس کو آزادخیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا، ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا، لیکن وہ ان تمام عقائد کا معترف نظر آتا ہے، جن کو معتقدات عوام کہتے ہیں، معراج کی نسبت اکثر علماے اسلام کا خیال ہے کہ روحانی تھی لیکن فیضی اس پر راضی نہیں چنانچہ کہتا ہے،

رہ راست برد کہ راہ کج نیست | حاجت بہ دلائل و حجج نیست

آں را چہ وقوف ازیں مقام است　　کو منکر خرق و التیام ست

سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو کچھ سنتے ہیں، زبانی سنتے ہیں تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجدی نظر آتا ہے،

فیضی اگرچہ ریاکار مولویوں کو نہایت بُرا سمجھا تھا، لیکن اصلی مقدس بزرگوں سے نہایت عقیدت رکھتا تھا، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی سے اس کو نہایت خلوص تھا، ایک مدت تک فتح پور میں بلا کر ان کو مہمان رکھا، پھر جب دربار کی مذہبی بدنامی پھیلی تو شیخ دلّی چلے گئے، فیضی نے بار بار بلایا، لیکن شیخ نے عذر کیا، بالآخر شیخ نے ایک خط لکھا، جس میں ان کو آئندہ تکلیف نہ دینے کا اظہار کیا، لیکن یہ بھی لکھا کہ خط وکتابت سے دریغ نہ کیجیے گا[1]، اخیر کے فقرے یہ ہیں،

"اگر بال وپرے می داشتم، ہر روز بر بام آں حجرہ می نشستم، و دانہ چیں نکات محبت می شدم، دیگر چہ نویسم، طلب ہائے دردانہ ازاں جا دیر می رسد از برائے خدا بر من قافلہ اسرار خود را راہ نہ بندند،

ملا صاحب، ان تمام باتوں کو فیضی کی ستم ظریفی سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ وہ گرمیٔ محفل کے لئے ان بزرگوں کو اپنے یہاں بلاتا تھا،

اس زمانے میں نشاطی صاحب ایک مہر کن ملا صاحب کے ساختہ پرداختہ تھے، وہ فیضی کے عروج کو دیکھ کر سخت جلتے تھے، اور اس کی شان میں ہجو آمیز اشعار کہا کرتے تھے، فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا،

شکر خدا کہ عشق بتان ست رہبرم　　بر ملّت برہمن و بر دین آذرم

---

[1] تاریخ بدایونی، تذکرۂ شیخ عبدالحق دہلوی،

اگرچہ فیضی نے اس شعر کے بعد بت اور برہمن کے معنی بتا دیئے تھے کہ متداول معنی مراد

بت چیست؟ رخِ نگاشتۂ معنی نہیں — کاندر کلیسیاے ضمیرست مضمرم
استاد، برہمن کہ زبت خانۂ خیال — در سجدۂ حضور فرود آورد سرم

لیکن نشانی صاحب، اس لطف کو کیا سمجھ سکتے تھے، اُنھوں نے اس کی چوٹ پر فوراً ایک قصیدہ لکھ ڈالا،

شکرِ خدا کہ پیروِ دینِ پیمبرم — حبِّ رسول و آلِ رسول ست رہبرم
قایل بروزِ حشر و قیامِ قیامتم — امیدوارِ جنت و حوری و کوثرم

یہانتک بھی غنیمت ہے لیکن ایک شوی میں فیضی کے کمالِ شاعری کا بھی انکار کرتے ہیں،

دعویٔ ایجادِ معانی کن — شمع نۂ چرب زبانی مکن
طبعِ تو ہرچند درِ ہوش زد — یک سخن نشنید نشد گوش زد
انچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند — درکہ تو سفتی دگراں سفتہ اند
خانہ کہ نظم بیاراستی — آب و گلش از دگراں خواستی
تازگی آں نہ زباران تست — از خوی پیشانی یارانِ تست
چندپے نقد کساں سوختن — چشم بہ مالِ دگراں دوختن
شربتِ بیگانہ فراموش کن — آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گرخضری آبِ حیات توکو؟ — درشکری شاخِ نبات توکو؟

ملا صاحب نے ان اشعار کو نشانی کے حال میں، نہایت جوش سے نقل کیا ہے،

خود بھی **فیضی** کے حال میں فرما چکے ہیں کہ چالیس برس تک استخواں بندی کرتا رہا، لیکن ایک شعر مزہ کا نہ نکلا، لطف یہ کہ نلدمن کے ذکر میں خود لکھ چکے ہیں، کہ تین سو برس سے ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی، ملا صاحب کی ان دو رنگیوں پر بے ساختہ یہ شعر یاد آتا ہے،

ازاں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم | کہ شیوہ ہاے ترا باہم آشنائی نیست

فیضی کو اپنے خاندان سے نہایت محبت تھی، تفسیر میں کوئی موقع نہ تھا، لیکن اپنے آٹھوں بھائیوں کا ذکر کیا ہے، خطوط میں **ابوالفضل** کو علامی اخوی نواب اخوی لکھتا ہے اور اس انداز سے لکھتا ہے، کہ محبت کا نشہ ٹپکتا ہے، قصیدہ فخریہ میں ابوالفضل کی نسبت لکھتا ہے،

بااین چنیں پدر کہ نوشتم مکارمش | در فضل مفتخر ز گرامی برادرم

صد سالہ در میان من و دوست در کمال | در عمر اگرچہ یک دو سہ سالے فزوں ترم

۹۹۶ سنہ ہجری میں اکبر کے ساتھ پشاور میں تھا کہ خبر پہنچی کہ والدہ بیمار ہیں، بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر لاہور پہنچا، یہاں ان کا انتقال ہو چکا تھا، بے تاب ہو گیا، اس عالم میں جو خط لکھے ہیں، ان سے خون ٹپکتا ہے، ایک دوست کو لکھتا ہے،

"بالفعل حالے دارد کہ بندہ را نمی تواں شناخت، بدن در کاہش افتادہ واندوہ کارگر آمدہ، ضعف و اسہال روی نمود، و دل از حیات سرد شدہ بخدای خدا سوگند کہ از ہزار یکے نوشتہ است"

تین برس کا بچہ مر گیا ہے، اُس کے غم میں جانگداز مرثیہ لکھا ہے،

شد وقت آں کہ دیدہ چو دل غرق خوں کنم | خوں نابہ گرہ شدہ از دل بروں کنم،

آں غصہ کہ پیش نخوردم کنوں خورم | واں نالہ کہ پیش نہ کردم کنوں کنم

گویند غافلاں رہ صبر اختیار کن　　چوں اختیار در کفِ من نیست چوں کنم

اے روشنیِ دیدہ روشن چگونہ　　من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونہ

ماتم سراست خانۂ من در فراقِ تو　　تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونہ

بر خار و خس کہ بستر و بالیں خوابِ تست　　اے یاسمیں عذار سمن تن چگونہ

تصنیفات صاحب **مآثر الامراء** نے لکھا ہے کہ فیضی نے ایک سو ایک کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے جن کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

خمسہ، یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کا جواب، ان کی تفصیل خود ایک خط میں کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

"اسامی کتب خمسہ این ست، اول مرکز ادوار کہ اکثرے در فتح پور گفتہ شدہ بود، دوم **سلیمان و بلقیس** کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود، و چیزے چند ازاں گفتہ، سوم **نلدمن** کہ تمام شد، چہارم **ہفت کشور** کہ در احوالِ ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، پنجم **اکبر نامہ** کہ آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود"

ان میں سے دو کتابیں یعنی **نلدمن** اور **مرکز ادوار** انجام کو پہنچیں اور آج بھی ملتی ہیں، مرکز ادوار کی ترتیب شیخ ابوالفضل نے فیضی کے مرنے کے بعد کی،

مرکز ادوار کا عمدہ نسخہ ہمارے کتب خانہ میں جو اب ندوہ پر وقف کر دیا گیا، موجود ہے،

سنہ ۳۰ جلوس میں **فیضی** کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا، اور سب سے پہلے مرکز ادوار شروع کی، اس کے ساتھ اور مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ کچھ شعر کہے، لیکن

چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی، ۱۰۰۲ھ سنہ ۳۹ جلوس میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا کرنا چاہیے، اور سب سے پہلے نلدمن انجام پائے، چونکہ ہندوؤں کا قصہ تھا، اکبر کے میلانِ طبع نے اس کو مقدم رکھا، چنانچہ چار مہینے میں تمام ہوئی، چار ہزار شعر ہیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

ایں چار ہزار گوہر ناب　　کانگیختہ ام بہ آتشیں آب

فیضی نے یہ مثنوی اکبر کی خدمت میں پیش کی، اور دستور کے موافق اشرفیاں نذر کیں، اکبر نہایت محظوظ ہوا اور حکم دیا کہ خوشخط لکھوا کر جابجا مرقعے اور تصویریں شامل کی جائیں، نقیب خاں کو حکم ہوا کہ وہ پڑھ کر سنایا کرے،

ملا عبدالقادر صاحب بدایونی، ہر جگہ جہاں فیضی کا ذکر آتا ہے بے نقط سناتے ہیں، لیکن یہاں ان کو بھی مجبور ہو کر تعریف کرنی پڑی، چنانچہ فرماتے ہیں،

"واقعی مثنوی ست کہ دریں صد سال مثلِ آن بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر گفتہ باشد،

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ سب مثنویاں پوری ہوئیں، لیکن کوئی عینی شہادت پیش نہیں کی، بلکہ فیضی کے اشعار سے استدلال کیا ہے، لیکن جو شعر استدلال میں نقل کئے ہیں، اُن سے یہ ثابت نہیں ہوتا، اشعار یہ ہیں،

زیں ہفت رباط و چار منزل　　بندم بہ جمازہ پنج محمل
آں چار حروف ہفت خرگاہ　　کا درد میان بہ نیمہ راہ
چندیں اگرم اماں دہد بخت　　یک یک بیرم بپایۂ تخت

[1] یہ پوری تفصیل اکبر نامہ واقعات سنہ ۳۹ جلوس میں ہے،

گر نشکنندم سپہر بجاں　　بلقیس برم بر سلیماں

نل دمن اور مرکز ادوار پر ریویو آگے آئیگا، سلیمان بلقیس کا یہ انداز ہے،

الٰہی پردۂ تقدیس بکشائے　　سلیمانِ مرا بلقیس بنمائے

دلِ من با بتانِ آذری چند　　سلیمانے گرفتارِ پری چند

چنانم از بلندی دردہ آواز　　کہ آید ہُدہُد شوقم بہ پرواز

گرہ شد ہفت دریا در گلویم　　کشایش نیست ممکن تا نہ گویم

دگر رفتم کہ بگذارم مقابل　　شگافِ خانہ را بارو زنِ دل

اکبر کی ہم گجرات پر ایک مثنوی لکھی تھی وہ بھی ناپید ہے، چند شعر ایک خط میں نقل کئے ہیں، ملاحظہ ہوں،

ہمانندم اہالی وحکّام شہر　　کہ در شہر بودند مشہورِ دہر

ہمہ کردہ آویزۂ دست خویش　　کلید در گنجِ شاہاں بہ پیش

رسیدند از سر قدم ساختہ　　ز شادی سراپائے نشناختہ

سر خود نہادند بر پائے شاہ　　کہ مائیم سر تا قدم در گناہ

رمۂ کہ نگذشتہ در بندگی　　بصد گونہ داریم شرمندگی

رسیدیم در خدمتت بندہ وار　　بجز بندگی بندگاں راچہ کار

نہایت بھس بھسی اور ہندیانہ ترکیبیں ہیں، اس لئے قلم انداز کرتا ہوں،

موارد الکلم، تفسیر غیر منقوط لکھنے کا جب ارادہ کیا، تو مشق کے طور پر پہلے یہ کتاب لکھی کہ ہاتھ صاف ہو جائے، کلکتہ میں چھپ گئی ہے، فیضی کے ایک رقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۵؁ ہجری کی تصنیف ہے، فیضی نے اس کو بلادِ عرب میں بھیجا تھا، اور لوگوں نے

حسبِ دستور اس کو بہت کچھ داد دی،

سواطع الالہام یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی، کل مدتِ تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں اکثر فخر سے اس کا تذکرہ کرتا ہے، جن لوگوں نے تاریخیں اور تقریظیں لکھیں، ان کے نام بھی لکھے ہیں، ایک خط میں لکھتا ہے:

"در عاشر ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ اثنین و الف کہ سال حال ست، تمام شد ایں عطیۂ غیبی مخصوصِ فقیر بود، غرابتش زیادہ ازان ست، کہ حیرت افزائے ایں فن نہ گردد۔"

دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب ابتدا کی تو والد کو دکھایا، وہ بہت خوش ہوئے اور بعض فقرے بدل دئے، چھٹا حصہ تمام ہوا تو اکبر نے فیضی کو دکن کی مہم پر بھیج دیا، اس مہم میں ایک سال سے زیادہ توقف ہوا، اسی اثنا میں شیخ مبارک کا انتقال ہو گیا، پھر تفسیر رک گئی، اور ایک سال سے کچھ کم رکی رہی، دوسرے سال کے آغاز میں شروع کی، اور انجام کو پہنچائی، تفسیر خیر جو کچھ ہے ہے لیکن تاریخیں اور تقریظیں خوب لکھی گئی ہیں، ملا حیدر کاشانی نے پوری قل ہو اللہ سے تاریخ نکالی، یعنی اس سورۃ کے حرفوں کے عدد شمار کئے جائیں تو ۱۰۰۲ ہوتے ہیں، ایک اور شخص نے اس آیت سے تاریخ نکالی لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین ظہوری اور ملک قمی نے قصیدے اور رباعیاں لکھیں، چند رباعیاں درج کرتا ہوں جن میں غیر منقوط ہونے کی توجیہ شاعرانہ طریقہ سے کی ہے،

دانائے ازیں دفتر کل دریا شد — پیداست نقاطش زچہ ناپیدا شد
شد وقت حصاد، دانہا خرمن گشت — شد سیر تمام، قطرہ ہا دریا شد

از چین سخن گراں سخن نتواں ساخت
بوے بوزید صفحہ مشک افشاں ساخت

صیاد خیال از پے آہوے قلم
ہر نافہ کہ چید در بغل پنہاں ساخت

این نسخہ کہ شاد کرد ناشاداں را
رو ساختہ شاگردی استاداں را

بر نقطہ زتار خط نیفگند کمند
در بند رو انداشت آزاداں را

اے بخت بیا یاری این بیکس کن
تا پیش روم موانع رہ پس کن

ہر نقطہ کہ کردند ازیں نسخہ بروں
شد مہر لب سخن ظہوری بس کن

این خردہ چہ خردہا کہ نایاب شدند
ذرات دریں شعشعہ سیماب شدند

از پردۂ لفظ حسن معنی بدمید
خورشید برآمد، اختراں آب شدند

فیض ازل از چہرہ برافگند نقاب
از لوح خرد، سرزد آثار حجاب

سرزد خورشید معنی از مشرق لفظ
نیلوفر نقطہ سر فرو برد بہ آب

سخت تعجب ہے کہ فیضی جیسے حکیم اور فلسفہ پسند شخص نے کیونکر یہ بیہودہ معز کاوی گوارا کی، تفسیر کو پڑھ کر، بجز اس کے، کہ جا بیجا مہمل الفاظ جمع کر دیے ہیں، اور کچھ اثر طبیعت پر نہیں ہوتا، یہ سچ ہے کہ اور کوئی شخص اس کمان کو زہ نہیں کر سکتا، لیکن بہر حال ایک لغو کام ہے، کسی سے بن آئے یا نہ آئے، طرہ یہ کہ فیضی کے مخالفین نے اس موقع پر بھی اعتراض کیا تو یہ کیا کہ آج تک کسی نے بے نقط تفسیر نہیں لکھی، اس لئے یہ بدعت ہے، اور اس لئے خلافِ شریعت ہے فیضی نے برجستہ جواب دیا، کہ خود کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سرتاپا غیر منقوط ہے،

انشای فیضی، نور الدین محمد عبداللہ بن حکیم عین الملک، کہ نسلاً ایرانی اور خود ہندوستان زا تھے، فیضی کے بھانجے اور شاگرد تھے، انھوں نے فیضی کے تمام مکاتیب

خطوط مہیا کرکے، ایک مجموعہ مرتب کیا، اور لطیفہ فیضی نام رکھا، اس وقت تک خطوط اور مراسلات سے بیان واقعہ کے بجائے زیادہ تر اظہار انشا پردازی مقصود ہوتا تھا، فیضی پہلا شخص ہے، جس نے سادہ نگاری کی ابتدا کی، اس طرز میں اس کا کوئی نظیر ہے تو حکیم ابو الفتح ہے، جس کے رقعات چار باغ کے نام سے مشہور ہیں،

فیضی کے خطوط سے اس زمانے کے تمدن، تہذیب، معاشرت آداب رسوم ہر قسم کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں، بعض بعض جگہ ہندی الفاظ بھی بول جاتا ہے، مثلاً والدہ کو "بوا جیو" کہا کرتا تھا، خط میں ان کا ذکر آگیا ہے تو یہی لفظ لکھ دیا ہے،

دیوانِ غزلیات کچھ اوپر نو ہزار شعر ہیں، خود دیباچہ لکھا ہے، اور یہ تعداد بھی اسمیں لکھی ہے، دیباچہ میں یہ بھی عذر کیا ہے، کہ اس میں پست و بلند ہر قسم کا کلام ہے، خاتمہ میں چند رباعیاں لکھی ہیں، ایک یہ ہے،

ایں قصرِ سخن یافت عمارت از من	دریافت ز اجناب اشارت از من
ہر نکتہ کہ می ریخت ز نوکِ قلمم	معنی ز خدا بود و عبارت از من

دیوان کا نام طباشیر الصبح رکھا، ایک خط سے جو ایک دوست کو لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان جب مرتب ہوا ہے، تو فیضی کی عمر ۴۰ سے کچھ اوپر تھی، اسی خط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا سلسلہ بند نہیں ہوا، بلکہ دوسرے دیوان کی طیاری کی ہے،

قصائد، مختصر سا مجموعہ ہے، حمد و نعت، مدح، فخر، تصوف، اخلاق وغیرہ مضامین پر الگ قصیدے لکھے ہیں، قصیدوں کی تعداد کم ہے، قصائد کئی کئی سو شعر کے ہیں، طرحیں بھی اپنے معاصروں سے الگ اختیار کی ہیں، بیٹے کا ایک مرثیہ بھی ہے، اور

نہایت پُر درد ہے، خاتمہ میں قطعات بھی ہیں، لیکن یہ قطعات دیوان میں بھی شامل ہیں بعض قصائد الحاقی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ قصیدہ،

وصی نبی آں کہ از صلبِ فطرت ... بہ شاہِ اولو العزم توام نشیند
امامے کہ روزِ وفاتِ پیمبر ... خلافت گذارد بہ ماتم نشیند
گر فتم معاند دریں تنگ میداں ... بر اشہب خرامد بر ادھم نشیند
بجا رتبۂ کعبہ یا بد سفیہے ... کہ فردا بہ قعرِ جہنم نشیند
جہاں پر شد از فتنہ یا شاہِ مرداں ... تو برخیز کاشوب عالم نشیند

ابو الفضل کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے،

تذکرہ، شعرا کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اس کے سوا کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ایک خط میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"کتاب مقاصد الشعرا را البتہ البتہ چوں تشریف آرند ہمراہ آرند کہ اختتام تذکرہ موقوف بہ آں ماندہ، واز کتب دیگر ہم انچہ توانند استنباط فرمودہ فرمایند کہ فقیر می خواہم، در خطبۂ آں ذکر شریف کنم"

مہابھارت، ۹۰۹ھ ہجری میں اکبر نے حکم دیا کہ مہابھارت کا ترجمہ کیا جائے، بڑے بڑے گنوان پنڈت جمع ہوئے، اکبر خود عبارت کا مطلب نقیب خاں کو سمجھاتا تھا، اور وہ فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر عبدالقادر بدایونی، ملا شیری وغیرہ کو الگ الگ ٹکڑے سپرد کئے، دو فن فیضی کے حصے میں آئے[۱]،

---

[۱] بدایونی واقعات ۹۹۰ھ ہجری،

اتھروَن بید، اس کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے لیکن عبد القادر بدایونی کی تحریر سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ۹۸۳؁ھ ہجری میں بھاون نام ایک برہمن جو دکن کا رہنے والا تھا، اسلام لایا، اور دربار میں حاضر ہوا، اکبر نے اس کو حکم دیا کہ اتھروَن بید کا ترجمہ کرائے، اول اون کا کام ملا عبد القادر بدایونی کے سپرد ہوا، یعنی بھاون مطالب سمجھاتا جائے اور یہ فارسی میں لکھتے جائیں، لیکن چونکہ اس کی عبارت نہایت پیچیدہ تھی، ملا صاحب نے عذر کیا، اکبر نے ملا صاحب کے بجائے فیضی اور پھر فیضی کے بجائے ابراہیم سرہندی کو ترجمہ کا حکم دیا، فارسی راماین کو بھی عام لوگ فیضی کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ محض غلط ہے، راماین کا ترجمہ اصل میں بدایونی نے ۹۹۹؁ھ ہجری میں چار برس کی محنت میں کیا تھا، پھر مسیحائے پانی پتی نے نظم میں لکھا، جو آج عام طور پر مشہور ہے،

لیلاوتی حساب میں ہے، فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی،

فیضی کی شاعری

فیضی فطرۃً شاعر تھا، اُس کا خاندان شاعری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا تعلیم و تربیت بھی شاعری کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی، تاہم وہ بچپن ہی سے شعر کہتا تھا، لیکن چونکہ طبیعت مشکل پسند تھی اور عربیت کا زور تھا اس لئے طبیعت زیادہ تر صنائع کی طرف مائل تھی، اپنا بچپن کا کلام کوئی شاعر محفوظ نہیں رکھتا فیضی نے بھی ضائع کر دیا ہوگا، لیکن ملا عبد القادر صاحب بدایونی کی بدولت ہم کو ایک غزل ہاتھ آئی ہے[۱]،

اے قدِ نیکوے تو سروِ رواں   دے خمِ ابروے تو شکلِ کماں
حلقۂ گیسوے تو دامِ جنوں   طرۂ ہندوے تو کامِ جناں

۱؎ بدایونی جلد ۳ تذکرہ محوی شاعر،

ہم لبِ جادوے تو آبِ حیات ہم خطِ دلجوے تو خضر زماں

پانچ شعروں کی غزل ہے اور صنعت یہ ہے کہ باوجود صنعتِ ترصیع کے ہر شعر چار بحروں میں پڑھا جاتا ہے،

ابتدا میں جو قصیدے ہیں اُن میں عربی نامانوس الفاظ کثرت سے ہیں اور یہ وہی ملائیت کا زور ہے، مثلاً

یکے معلّے شاہزادہ ہاے عظام کہ بر نہالِ فلک می کنند اغصانی

کشمیر کا پورا قصیدہ دیکھو،

ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج رونی کا تتبع کرتا تھا،

فیضی منم آں کہ در معانی گاہے بہ دو صد بنج گرفتم
تاکردہ دلم عروج مستی نہ خرچِ درج درج گرفتم
ذوقے کہ تواں گرفت از شعر از شعر ابوالفرج گرفتم

لیکن جس قدر اہل زبان سے اختلاط بڑھتا گیا، زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی، عرفی، ظہوری، ملک قمی سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں، خصوصاً عرفی کی زور طبع اور چاشنی سخن کا نہایت معترف ہے،

محتشم کاشانی کی تعریف میں لکھتا ہے،

حریر بافِ سخن محتشم کہ در کاشاں بہ طرزِ تازۂ طرز سخنوری دارد
یکے زنکتہ دراں گفت دیدم اشعارش عبارتے ست کہ معنی سرسری دارد
بگفتمش سخن او عبارتے ست و لے عبارتے کہ بہ معنی برابری دارد

ان باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسکی شاعری پر کن چیزوں کا اثر پڑا ہے،

فیضی نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، لیکن قصیدے بے مزہ ہیں، ابتدائے کلام ایک طرف اخیر کے قصائد سے بھی ملائیت کی بو آتی ہے، البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے، اور انہی دونوں صنف پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں،

جوشِ بیان (۱) فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھکر جوشِ بیان ہے، جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی، جوشِ بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے اور اعلیٰ درجہ پر ہے، لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے ہاں فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ، ہر قسم کے مضامین ہیں وہی جوش پایا جاتا ہے، جوشِ بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا،

غور کرو ایک شخص جس کے سینے میں تمام علوم و فنون کے خزانے بھرے ہوئے ہیں، فلسفہ اور حکمت کے نہایت دقیق نکتوں تک اس کی نظر پہونچتی ہے، اور وہ دیکھتا ہے کہ اور حریف معمولی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتے، آزاد خیالی اور بلند نظری اس کو آسمان تک پہنچائے دیتی ہے، ان سب باتوں کے ساتھ قسمت کی یاوری نے اس کو تختِ شاہی کے برابر کھڑا کر دیا ہے، ایسے شخص کے جوشِ مضامین کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، جب وہ تختِ شاہی کے پاس کھڑے ہو کر اکبر کو مخاطب کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سیہ مست خوش مستی میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، اور بنکار رہا ہے،

شاہنشاہا! خسرو پژوہا!	دریا گہرا! فلک شکوہا!
بزمے ست جہاں بہ عیش پیوست	دورِ تو شراب و آسماں مست
امروز بہ ایں نوائے چوں شہد	من بار بدم تو خسرو عہد
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے	پیشِ تو ستادہ ام بیک پائے

این نامہ کہ عشق بر زباں برد — طغرائے ترا بہ آسماں برد
این چار ہزار گوہرِ ناب — کانگیختہ ام بہ آتشیں آب
بپذیر کہ آبِ گوہرِ تست — از بہر نثار افسرِ تست
پیمانۂ من اگر نشد پُر — دریا کہنت نثار نہ دُر
گر عشق چنیں بسوزدم پاک — مہتاب برون برآرم از خاک
بگداختۂ آبگینۂ دل — آئینہ دہم بدستِ محفل
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف — از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگِ قلمم دریں شبِ تار — بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار
ہر صبح بہ فیضِ بادشاہی — من بودم و بادِ صبح گاہی

اکبر نے جب نلدمن کی فرمائش کیلئے دربار میں بلایا ہے اس حالت کو دیکھو کس جوش سے بیان کرتا ہے

برخاستم از زمین فلک تاز — بر خاستنہ مو بمو بہ پرواز
چشمے کہ برہ گذار کردم — چشم دگرش نثار کردم
بگذشتم ازاں درِ ادب ریز — کو نین گذاشتہ بہ دہلیز
دیدم دو جہاں بیک جہاں در — صد عمر ابد بیک زماں در
پیوند زمینیاں گسستم — نزدیک بہ آسماں نشستم

یہی جوش فلسفیانہ اور عشقیہ مضامین میں بھی قائم ہے،

اے عشق ارخصت ست کہ از دوشِ آسماں — بر دوشِ خود نہم علمِ کبریائے تو
نظرفیض چو بر خاک نشیناں فگنم — مور را مغز سلیماں رسد از قسمتِ ما
از تفِ بادۂ ما بال ملائک بگداخت — وائے آں روز کہ برقے جہد از شیشۂ ما

روے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ — آں جا کہ لطمہ ہاے ید اللہ می زنند

ایں چہ می بود کہ ساقی بقدح ریخت فرو — کہ مسیح و خضر از رشک کشاکش کردند

مپرس اہلِ نظر چوں بعرش پیوستند — کہ پا بکنگرۂ دل نہادہ برجستند

عشق، صبر و خرد و ہوش ز فیضی بربود — دزدِ رہ بیں کہ باں قافلہ سالار چہ کرد

شدیم خاک و لیکن ببوے تربتِ ما — تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

عشق تا پاے بیفشرد در اندیشۂ ما — ہمہ معشوق تراود ز رگ و ریشۂ ما

بادہ در جوش ست و یاران منتظر — ساقیا! "خذ ما صفا دع ما کدر"

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما — جوشِ آتش بود امروز بفوارۂ ما

ہیچ دانی دلِ ما خرد چرا می شکنند — آسماں آئینہ ہا ساخت ز سیارۂ ما

دریں دیار گروہے شکر لباں ہستند — کہ بادہ با نمک آمیختند و بد مستند

فیضی کنم تہی و رہِ عاشقی بہ پیش — دیوانِ خود مگر بدو عالم گرد کنم

اقسامِ سخن میں فیضی فخریہ خوب کہتا ہے، اور اس عالم میں اسکا جوشِ بیان حد سے گذر جاتا ہے، ملاحظہ ہو،

امروز نہ شاعرم نہ حکیم — دانندۂ حادث و قدیم

ہر موے زمن تمام گوش ست — خاموشیِ من بصد خروش ست

تا تازہ و تر زنم رقم را — در بادہ کشیدہ ام قلم را

ایں شیشہ نہادہ ام براں طاق — کاں جا نہ رسیدہ دستِ عشاق

اسرارِ معانیم نظر کن — زیں گنج بہ مفلساں خبر کن

می ریخت ز سحر کاریِ ژرف — از صبح ستارہ وز من حرف

دروازۂ صبح بر چشم باز — گلگونہ شگافت بر تو انداز

ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم — خونے ست چکیدہ از دماغم

صد دیدہ بور طۂ دل افتاد — کیں موج گہر بہ ساحل افتاد

دکانِ ہنر چنیں کشودن — سامانِ سخن چنیں نمودن

ایں کارِ من ست کارِ کس نیست — اندازۂ اختیارِ کس نیست

چوں بر سپہم نظر فگندند — در معرکہ ام سپر فگندند

بر تافتم از دم سبک سیر — ناقوسِ برہمنانِ دیر

بنگر کہ چساں بصد تگ و تاز — بر تار معانیم رسن باز

ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار — ناقوس نہفتہ ام بہ زنار

ایں گل کہ بہ بوستاں نثاری است — از من بہ بہار یادگاری است

(۳) فیضی کی ممتاز خصوصیاتِ شاعری میں سے استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت ہے، اکبری دور کے شعرا میں یہ خصوصیت عام ہے، لیکن نوعی شیرازی اور عرفی اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز ہیں' اور فیضی ممتاز تر ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس خاص وصف میں فیضی پر عرفی کا اثر پڑا ہے، یا خود عرفی نے فیضی سے یہ شوخیاں سیکھی ہیں، ایک مستند ایرانی تذکرہ نویس نے فیضی کے حق میں یہ فیصلہ کیا ہے لیکن چونکہ تذکرہ نویس صاحب فیضی کے معاصر ہیں، اور فیضی دربار کا ملک الشعرا تھا، اس لئے خوشامد کے سوے ظن کا موقع باقی رہتا ہے،

بہرحال استادی و شاگردی کی بحث نہیں لیکن فیضی کی شوخی استعارات اور جدتِ تشبیہات سے انکار نہیں ہو سکتا، مثالیں ملاحظہ ہوں،

بزمے ست جہاں بہ عیش پیوست　　　دورِ تو شراب و آسماں مست

زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے　　　پیشِ تو ستادہ ام بیک پائے

گر عشق چنیں بسوزدم پاک　　　مہتاب بروں برآرم زخاک

بگداختہ آبگینۂ دل　　　آئینۂ دہم بدستِ محفل

بگداختہ ام دل و زباں را　　　کیں نقش نمودہ ام جہاں را

امروز بدورانِ ایام　　　زد نوبتِ من سپہر بربام

آنم کہ بہ سحر کاری ژرف　　　از شعلہ تراش کردہ ام حرف

بانگ قلم دریں شبِ تار　　　بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار

برخاستم از زمیں فلک تاز　　　برخاستہ مو بمو بہ پرواز

(۳) وہ اکثر فلسفیانہ مضامین باندھتا ہے، جس کے ساتھ ادعا اور غرور کی جھلک بھی ہوتی ہے،

گویند ہمرہانِ طریقت کہ اے رفیق　　　آگاہ شو کہ قافلہ ناگاہ می زنند

روے کشادہ باید و پیشانیٔ فراخ　　　آں جا کہ لطمہ ہاے یداللہ می زنند

اس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جہاں خدا کے ہاتھ کے طمانچے پڑتے ہیں وہاں شگفتہ روئی اور کشادہ جبینی درکار ہے، مطلب یہ ہے کہ صدماتِ قضا و قدر کی برداشت یا تجلیات کی برق افگنی کے لئے نہایت صبر و استقلال درکار ہے،

عجب تر از دلِ فیضی ندیدہ ایم طلسم　　　کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص

چہ کشتہاست کہ در زلف بتاں تعبیہ شد　　　کز حقیقت دو جہاں رو بہ مجاز آوردند

گروے گم شود از حلقۂ عشاق بپرس　　　ہرچہ بردند دریں قافلہ باز آوردند

عشق تا پاے بیفشرد در اندیشۂ ما ۔۔۔ ہمہ معشوق تراود ز رگ و ریشۂ ما

مسافرانِ طریقت ز من جدا مشو ۔۔۔ کہ دور بینم و چشمم بہ منزل افتادہ است

غافل نیم ز راہ و لے آہ چارہ چیست ۔۔۔ زیں رہزناں کہ بہ دلِ آگاہ می زنند

اگر ہمرے نہ کشم سوے بیخودی چہ کنم ۔۔۔ مرا ز ہمرہے خود ملال می گیرد

بگریز کہ دورانِ فلک عربدہ خیز ست ۔۔۔ آئینِ حریفاں ہمہ کج دار و مریز ست

در دشت آرزو بنود بیم دام و دد ۔۔۔ راہے ست این کہ ہم ز تو خیزد بلاے تو

خاک بیزاں رہِ فقر بہ جاے نزوند ۔۔۔ گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند

فیضی کے دل میں فلسفیانہ خیالات کا جب زور ہوتا ہے اور ان کے اظہار میں جب وہ مجبور ہوتا ہے تو اس مجبوری کو عجیب انداز سے ظاہر کرتا ہے،

فلسفیانہ مسائل اس کے دل و دماغ میں بھر گئے ہیں، چاہتا ہے، کہ ظاہر کرے لیکن جانتا ہے کہ لب ہلے اور ظاہر بیں علما قابو سے جاتے رہے، چونکہ علمار ہی کے گروہ میں زندگی بسر کی ہے، اور اپنے آپ کو اس گروہ سے باہر نکالنا نہیں چاہتا، اسلئے چاہتا ہے کہ اصل حقیقت بھی ظاہر کی جائے اور ہم فنون کا ساتھ بھی نہ چھوٹنے پائے، لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے، مجبوراً ساتھیوں سے انقطاع پر آمادہ ہوتا ہی، اور کہتا ہی؛

آں نیست کہ من ہم نفساں بگذارم ۔۔۔ با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

اسی مضمون کو ایک اور پیرایہ میں ادا کرتا ہے، •

فیضی از قافلۂ کعبہ رواں نیست بدن ۔۔۔ ایں قدر ہست کہ از ما قدمے در پیش ست

بعض وقت اس کو خیال آتا ہے کہ مسلمان بت پرستی کے دشمن ہیں لیکن کعبہ کی در و دیوار کی تعظیم میں ان کا جو طریقِ عمل ہے، اس میں ظاہر پرستی کا صاف

شابہ پایا جاتا ہے، اس خیال کو یون ادا کرتا ہے،

آن کہ می کرد منع پرستیدن بت | در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

پھر غور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ نہین کعبہ پرستون کی یہ اخیر منزل نہین مقصود اصلی وہی ذات بحت ہے لیکن مبتدیون کو ان ابتدائی منزلون سے گذرنا پڑتا ہے، اس بنا پر کہتا ہے،

کعبہ را ویران مکن اے عشق کانجا یک نفس | گہ گہے پس ماندگان راہ منزل می کنند

(۴) غزل مین عام شعرا کا قاعدہ ہے کہ کوئی قدیم طرح سامنے رکھ لیتے ہین، پھر ایک ایک قافیہ پر نظر ڈالتے ہین اور جو قافیہ جس انداز سے بندھ سکتا ہے باندھتے جاتے ہیں، رفتہ رفتہ غزل پوری ہو جاتی ہے، یہ بہت کم ہوتا ہے کہ پہلے کوئی مسلسل یا مفرد خیال دل میں آئے اُس کو شعر میں ادا کریں، پھر غزل پوری کرنے کے لیے اور اشعار بھی لکھتے جائیں لیکن فیضی کی اکثر غزلوں میں صاف نظر آتا ہے کہ کسی واقعہ کے اثر سے کوئی خیال دل میں آتا ہے، اور اسی کو وہ ادا کر دیتا ہے، خطوط میں جا بجا لکھتا ہے کہ فلاں واقعہ نے یہ خیال پیدا کیا، اور وہ غزل کی صورت میں ادا ہوا، مثلاً دکن کے سفر میں ایک دفعہ کچھ ہنگامہ ہوا، لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے، فیضی نے بہت روکا، کسی نے نہ سُنا اُس وقت بے اختیار اُس کی زبان سے یہ غزل ادا ہوئی،

باز یاران طریقت سفرے در پیش است | رہ نوردان بلا را خطرے در پیش است

کس نمی گوید م از منزلِ اوّل خبرے | صد بیابان بگذشت و دگرے در پیش است

ہمرہاں این ہمہ نومید نباشید از من | کہ دعاے سحرم را اثرے در پیش است

ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم — شکر کن قافلہ را راہبرے در پیش است

اے صبا! بر سر آفاق گل مژدہ بریز — کہ شبِ تیرۂ ما را سحرے در پیش است

فیضی از قافلۂ کعبہ رواں بیروں نیست — ایں قدر ہست کہ از ما قدمے در پیش است

اسی طرح اکبر جب گجرات کی مہم سے آیا ہے، تو ایک غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے؛

نسیم خوش دلی از فتحپور می آید — کہ بادشاہ من از راہ دور می آید

احمد آباد گجرات میں پہونچا ہے، تو وہاں کے دلفریب حسن نے اس پر ایک خاص اثر کیا ہے، وہی غزل میں ادا کرتا ہے،

منم کہ کشتۂ گجراتیاں بیدادم — خرابِ عشوۂ خوبانِ احمد آبادم

سہی قدے ز سر ناز جلوۂ ننمود — کہ ہمچو سایہ بہ دنبالِ آں نیفتادم

بہر طرف کہ خرامید سرو آزادی — غلام او شدم و خطِ بندگی دادم

چو رشک گلشن فردوس احمد آباد است — ازو مباد برونم کشند چوں آدم

بہ حسن مردم گجرات یاد نیست دلے — نمی روند جوانانِ دہلی از یادم

لیکن انصاف یہ ہے کہ ایک حکیم، ایک فلسفی، ایک ادیب عشق کی کڑیاں نہیں جھیل سکتا،

بہ سوزِ عشق، شاہان راچہ کار است — کہ سنگِ لعل، خالی از شرار است

اس بنا پر فیضی کے عشقیہ اشعار میں وہ سوز وگداز نہیں، جو عاشق تن شعرا کا خاصہ ہے، نظیری فتنہ گران گجرات کی شان میں کچھ کہتا تو تم دیکھتے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے،

بہر حال فیضی کے تغزل کا اندازہ کرنا چاہو تو اشعار ذیل سے کر سکتے ہو۔

آنچه فیضی نظرِ دوست کرد		مشکل اگر دشمن جانی کند

تا شکری عشق چواں تواں کرد		غم بر سرِ غم فزود مارا

حیران فسوں سازی عشقم کہ خیالت		از دیدہ درول آید و در سینہ نگنجد

شب وصل کے ذکر میں ایک غزل لکھی ہے، دو شعر سننے کے قابل ہیں،

نہ گویم اے فلک از کجرویہایت تو بر گردی		شبِ وصل است خواہم اندکے آہستہ تر گردی

زمہتابِ خش کاشانۂ من روشن است امشب		اگر وقتِ طلوعت آید اے خورشید بر گردی

عرفی شیرازی

عرفی کا نام و نسب | محمد نام، جمال الدین لقب، عرفی تخلص، باپ کا نام زین الدین ملوی اور دادا کا جمال الدین چادر باف تھا، ایران میں اُن محکمہ جات اور عدالتوں کو جو مذہبی صیغہ سے تعلق نہیں رکھتیں "عرف" کہتے ہیں، عرفی کا باپ شیراز کی دارالحکومت میں ایک معزز عہدے پر ممتاز تھا، عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا تھا، مآثر رحیمی میں ہے:-

"چوں پدرش بعض اوقات در دیوان حکام فارس بہ امر وزارت دار دغہ دارالافاضل شیراز مشغولی می نمود، مناسبت شرعی عرفی را منظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد"

اس تخلص کے اختیار کرنے کے بعد اس قدر اور کہنا ضرور ہے کہ عرفی فطرۃً مغرور

لہ عرفی کے حالات اگرچہ مختصراً عام تذکروں میں ملتے ہیں، لیکن مستند اور دلچسپ واقعات مآثر رحیمی اور تذکرۂ عرفات احدی کے سوا اور کسی تذکرہ میں نہیں پائے جاتے، مآثر رحیمی، اصل میں عبدالرحیم خانخاناں کی سوانحعمری ہے لیکن اس میں تمام اُن شعرا اور اہل فن کا تذکرہ ہے، جو خانخاناں کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اس کتاب کا مصنف خود اُن شعرا کا ہمعصر تھا، اس لئے دلچسپ حالات بہم پہونچائے ہیں اور اکثر واقعات چشم دید لکھے ہیں، عرفات کا مصنف بھی قریب قریب اسی زمانہ میں تھا، اور اس نے عرفی کو تیس برس کی عمر میں دیکھا تھا، یہ دونوں کتابیں میرے پیش نظر ہیں،

اور خود ستا تھا، چونکہ ایران کے اکثر شعرا معمولی خاندانوں سے تھے، مثلاً خاقانی بڑھئی تھا، فردوسی باغبانی کرتا تھا، باقر کاشانی خردہ فروش تھا، برخلاف اس کے عرفی ایک معزز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کا باپ سرکاری محکمہ سے بھی تعلق رکھتا تھا، اس لئے تخلص میں بھی فخر کی ادا قائم رکھی عرفی نے نام و نسب پر اکثر فخر کیا ہے اور یہ بھی اس کے خصوصیات میں ہے ورنہ ایران کے شعرا میں نسب کا فخر بہت ہی شاذ و نادر پایا جاتا ہے،

عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی، شاہ نواز خاں (مصنف مآثر الامرا) نے تذکرہ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی نے علاوہ معمولی علوم کے مصوری و نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی، عرفی نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا، اور طہماسپ و عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمایش گاہ بنا دیا تھا، بالخصوص شاعری بڑے زوروں پر تھی، محتشم کاشی، وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ نے فغانی کی طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا، اور تمام ملک ان کی زمزمہ سنجیوں سے گونج اٹھا تھا، عرفی نے بھی اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان پسند کیا، اور باوجود کم سنی کے بڑے بڑے پرانے استادوں کے ساتھ معرکہ آرائی شروع کر دی، اس زمانے میں فغانی کی اکثر غزلیں طرح کی جاتی تھیں، اور محتشم کاشی وغیرہ ان میں غزلیں لکھتے تھے، عرفی بھی انہی طرحوں پر غزلیں لکھتا تھا، اور عام مشاعروں میں بے باکانہ پڑھتا تھا، وحشی یزدی یزد میں سکونت رکھتا تھا، اس لئے اس سے تحریری مناظرات رہتے تھے، اوحدی نے لکھا ہے کہ جب میں شیراز گیا تو مشہور شعرا کے نام دریافت کئے، لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا، شیراز میں ایک دوکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا، یہاں عارف لاہجی، حسین کاشی مورخ، میر ابوتراب، تقیائے شیستری مخاطب بہ مورخ خاں، رضای کاشی وغیرہ مشاعرے کرتے تھے، مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی

سے مباحثہ ہوا، عرفی نے دعویٰ کے دونوں پہلو مخالف اور موافق لیئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا،

عرفی کی قدر دانی کے لئے اگرچہ ایران میں بھی کچھ کم سامان نہ تھا، تاہم ہندوستان کی سی بات کہاں نصیب ہوسکتی تھی، جس کی بدولت ایران کے ہر ہر گوشے سے اہلِ فن کھنچتے چلے آتے تھے،

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق ہو کر آیا، بہر حال اس نے ہندوستان کا رُخ کیا، راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی، اس پر یہ رباعی لکھی،

دوشینہ کہ بردبرد دشم بود　　زانو چو عروسِ نو در آغوشم بود

پوشیدنئے نہ داشتم غیر از چشم　　پیرنے کہ بزیر سرشم گوشم بود

ہندوستان میں اگرچہ سیکڑوں امرا اور اہلِ دول تھے، لیکن عرفی نے ان سب میں فیضی کو انتخاب کیا جس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار تک پہنچنا آسان تھا، یا یہ کہ سخن شناسی کی توقع جو فیضی سے ہوسکتی تھی اور کسی سے نہیں ہوسکتی تھی، عرفی فتحپور سیکری میں فیضی سے ملا فیضی نے اس کی پوری قدر دانی کی، پنجاب کے سفر میں وہ اٹک تک فیضی کے ہمرکاب رہا اور اس کی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے انجام پاتی رہیں[۱] لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے صحبت برآر نہ ہوسکی، اور بالآخر اس دربار سے قطعِ تعلق کرنا پڑا،

اس زمانہ میں اکبری دربار کے نورتن سب موجود تھے، ان میں حکیم ابوالفتح گیلانی

---

[۱] تاریخ بدایونی،

اگرچہ ظاہری منصب و اقتدار کے لحاظ سے سب سے کم پایہ تھا یعنی صرف ہزاری منصب رکھتا تھا لیکن بڑا عالم اور علم وفضل کا بڑا قدردان تھا، اس کے ساتھ عرفی کا ہم وطن اور ہم مذہب تھا، ان خصوصیات کی بنا پر اس نے اسی کو ترجیح دی اور قصیدہ مدحیہ لکھ کر پیش کیا، یہ پہلا دن تھا کہ عرفی کے غرور کی آن ٹوٹی، غالباً خود عرفی کو بھی اس کا سخت صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

چونکہ حکیم ابوالفتح بڑا نکتہ شناس اور نقاد فن تھا، عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بہت ترقی کی، حکیم ابوالفتح نے ایک رقعہ میں جو خانخاناں کے نام ہے یہ الفاظ لکھے ہیں،

"ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ[۱] اند"

اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ امراء اور اہل دول علم وفضل میں یہ پایہ رکھتے تھے کہ عرفی جیسے اہلِ کمال ان کی صحبت سے مستفید ہو سکتے تھے، عرفی نے بھی حکیم ابوالفتح کی احسانمندی کا پورا حق ادا کیا، جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے، اکبر و خانخاناں کی مدح میں بھی نہیں لکھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ابوالفتح زندہ رہا اس نے خود اپنی خواہش سے کسی دربار کی طرف رُخ نہیں کیا،

حکیم ابوالفتح اور خانخاناں سے نہایت درجہ کا اتحاد تھا، حکیم موصوف کی فرمائش سے عرفی نے خانخاناں کی مدح میں قصیدہ لکھا، جس کا مطلع یہ ہے، ع

بیا کہ با دلم آں می کند پریشانی

اس قصیدہ میں اس واقعہ کا نہایت لطیف پیرایہ میں ذکر کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

ازاں نہ دیدہ ثنا گویمت کہ می بینم   ترا و اورا یکتن بچشم روحانی

---

[۱] خزانہ عامرہ ذکر حیاتی گیلانی،

دلیل وحد تم این بسکہ مدح خود بخواست | مرا بمدح تو فرمود گوہر افشانی

حکیم ابوالفتح نے ۹۹۷ھ ہجری میں انتقال کیا، عرفی پر اس واقعہ کا سخت اثر ہوا، چنانچہ اس زمانہ میں خانخاناں کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اُس میں کہتا ہے،

چہ احتیاج کہ گویم کہ مرد و عرفی را | چہ بر سرازہوسِ مرگ ناگہاں آمد

برفت و لطف تو برمن گذاشت ایں بدنی ست | بہ نزدِ عقل کہ تاوان آں زیاں آمد

تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید (یعنی ابوالفتح) | چہ گنجہائے سعادت زیانِ جاں آمد

حکیم ابوالفتح کے مرنے کے بعد عرفی، خانخاناں کے درباریوں میں داخل ہوا، اور پھر خاندان شاہی کے سوا، اور کسی کے آستانہ پر کبھی سر نہیں جھکایا، چنانچہ خود فخریہ کہتا ہے،

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر | صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

خانخاناں امرائے اکبری کا گل سرسبد تھا، اس زمانے میں وہی ایک شخص تھا، جس کے تاجِ فخر پر صاحب السیف والقلم کا طرہ زیب دیتا تھا، گجرات کی فتح جس میں اس نے دس ہزار فوج سے چالیس ہزار کی جمعیت کو شکست دی، اس کی شجاعت کا ایک معمولی کارنامہ ہے، خود شاعر اور شعراء کا بڑا قدردان تھا، عبدالباقی نہاوندی نے اس کے مفصل حالات دو جلدوں میں لکھے ہیں، ایک جلد میں صرف اس کے دربار کے شعراء اور اہلِ کمال کا تذکرہ ہے،

عرفی نے خانخاناں کے دربار میں پہونچ کر خاطر خواہ ترقی کی، مآثرِ رحیمی میں لکھا ہے،

"بہ اندک فرصتے بہ یمن تربیت و شاگردی و مداحی ایں دانای رموز نکتگی تمام و ترقی مالا کلام در منظوماتش بہم رسید"

چونکہ خانخاناں کے دربار میں بڑے بڑے نامور شعرا مثلاً نظیری نیشاپوری، شکیبی اصفہانی، انیسی، ظہوری وغیرہ سے مقابلہ رہتا تھا، عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ تقرب اور اختصاص میں بھی وہ حریفوں کی صف کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا، یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جاتا تھا تو عام طریقہ پر آداب و کورنش نہیں بجا لاتا تھا، اور جس جگہ جس طرح چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

"درایام ملازمت تسلیم و کورنشے کہ در ہندوستان متعارف ست کہ بعوض سلام بصاحبان می کنند بہ صاحب خود نمی کرد، و بہر طرف طور درو شے کہ میخواست در مجالس می نشست، واہل عالم تقدیم او را قبول می نمودند"

خانخاناں نے عرفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو فیاضیاں کیں، اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ قصیدے پر ستر ہزار روپیہ انعام دلوائے[1]،

عرفی نے اگرچہ خانخاناں کے سوا امرا اور اہلِ دربار میں سے کسی کی مدح سرائی گوارانہ کی، لیکن فرماں روائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی، اس لئے خود اپنی خواہش یا خانخاناں کی فرمائش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے، لیکن ابوالفضل اور فیضی کے آگے اس کا چراغ نہیں جل سکتا تھا، ابوالفضل نے اکبر نامہ اور آئینِ اکبری دونوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس طرح کہ نہ کرتا تو اچھا تھا، اکبر نامہ میں لکھتا ہے،

"درے از سخن سرائی بروکشودہ بود، در خود نگریست و بر باستانیاں زبان طعن کشود، غنچۂ استعداد او نشگفتہ پژمردہ"

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عرفی حد سے زیادہ مغرور اور خود ستا تھا، اور اساتذہ سلف

---

[1] خزانہ عامرہ تذکرہ عرفی،

کا نام اپنے مقابلہ میں تحقیر سے لیتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز　　بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را

روح اللہ ز اعجاز نفس ثمین شاں بُ　　تا من قلم اندازم و گیرند قلم را

تفرجے کہ من از بہر روح ساز دہم　　نہ انوری نہ فلانی دہد نہ بہمانی

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز ار چہ بود　　گر ہمی دانست باشد مولد و ماوائے من

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد　　بہ امداد صبا اینک فرستادم بسر دانش

اس کے فخر و غرور سے تمام ہمعصر نالاں تھے، یہاں تک کہ نظیری نیشاپوری جو ایک مرنج مرنجاں شاعر تھا اس سے بھی ضبط نہ ہو سکا، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو عرفی کے مرنے کے بعد اس کے جواب میں لکھا ہے کہتا ہے،

دریں قصیدہ بہ گستاخی ار چہ عرفی گفت　　بداغ رشک پس از مرگ سوخت خاقانی

کنوں بگور چناں او برشک می سوزد　　کہ در تنور، بواں گوسفند بریانی

قصیدۂ کشمیریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے ۹۹۶ھ ہجری میں کشمیر کا جو سفر کیا تھا، اس میں عرفی بھی ہمرکاب تھا، ایک قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی موقع پر ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن عرفی نے بجائے اس کے کہ شکر کا اظہار کرتا الٹے گھوڑے کی ہجو لکھی

شاہنشاہا حقیقت اسپے کہ دادۂ　　بشنو ز لطف تا برسانم بعز عرض

ہستم براو سوار و لیکن پیادہ ام　　گاہے بطول می زدم اکنوں زدم بعرض

خانخاناں اور اکبر کے سوا عرفی نے کسی اور آستانہ کی ناصیہ سائی کی تو وہ شاہزادہ سلیم تھا، اور عرفی کی تاریخ زندگی میں یہ واقعہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادہ مذکور کا جاں دادہ تھا، یہ امر اگرچہ بظاہر بالکل خلاف قیاس ہے لیکن

عرفی کے قصائد میں بے شبہہ یہ جھلک پائی جاتی ہے، شاہزادہ موصوف کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں ان کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ اور کوئی جوش ہے جس کا رنگ مداحی کے لباس میں بھی جھلک رہا ہے، عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز ہو سکتا ہے، کہ شہزادہ نے خود اس کو یاد کیا اور دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی عرفی جس شان سے دربار میں پہونچا ہے اور شہزادہ نے جس طرح اس سے نگاہ پنہاں کی زبان سے باتیں کی ہیں اسکی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے،

که ناگهان ز درم در رسید مژده دہے ... چنانکه از چمن طاعمم بمغز شمیم
چه گفت، گفت که "ای مخزنِ جواہر قدم" ... چه گفت، گفت که "اے مطلب بہشت نعیم"
بیا که از گہرت یاد می کند دریا ... بیا که تشنہ لبت را طلب کند تسنیم
بره فتادم و گشتم چناں شتاب زده ... که دستِ اہل کرم در نثار گوہر و سیم
مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد ... بلطفِ خاص بدل کرد التفاتِ عمیم
رموز کورنش و تسلیم را ادا کردم ... به ادب مردمِ دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر انچه گفتن داشت ... که در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم
لبش چو نوبتِ خویش از نگاه باز گرفت ... فتاد سامعه در موجِ کوثر و تسنیم

اخیر کے دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے:

"شہزادہ نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سُن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں اسکی نگاہ نے زبان پر پیش دستی کی، پھر جب نگاہ سے گذر کر ہونٹوں کی باری آئی تو میرے کان کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب گئے"

شیخ سعدی نے ایک قطعہ میں یہ مضمون باندھا تھا کہ اس شاعر کو عاشقی کا نام نہ

نہ لینا چاہیے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہہ کر مداحی شروع کر دیتا ہے، عرفی نے اس پر ایک قطعہ لکھا ہے، اس میں شہزادہ سلیم کی معشوقی کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے،

قطعہ
دی کسے گفت کہ سعدی گہر افروزِ سخن | گفت کہ اندیشہ بران می نازد
سخنِ عشق حرام ست بران بیہدہ گوے | کہ چو دہ بیت غزل گفت، مدیح آغازد
گفتم ایں خود ہمہ عیب ست کہ در راہ تمیز | ہر کہ ایں لاف زند رخشِ دوئی می تازد
لوحش اللہ زیک اندیشی عرفی کو را | آنکہ ممدوح بود عشق بہ او می نازد

یعنی سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے، لیکن بہرحال معشوق کے علاوہ ان کا کوئی ممدوح بھی ہے، لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے،

وفات تذکرۂ داغستانی وغیرہ میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اس کو زہر دیدیا، بعضوں نے لکھا ہے کہ زہر دینے کی وجہ شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا اظہار تھا، ابو الفضل نے اکبر نامہ میں ۹۹۹ھ ہجری کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے،

"سیزدہم، عرفی شیرازی رخت ہستی بربست، درے از سخن سرائی بروے کشودہ بودند، اگر در خود نہ نگرستے زندگی را بشائستگی سپردے وزمانہ لختے فرصت دادے، کار او بلند، دریں زندگی ایں رباعی برسنجیدہ بود"

عرفی دم نزع است وہمان مستی تو | آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو
فردا است کہ دوست نقد فردوس بکف | جویاے متاع ست وتہیدستی تو

انتقال کے وقت اس کی عمر ۳۶ برس کی تھی،

تذکرۂ داغستانی میں لکھا ہے کہ لاہور میں مدفون ہوا، اور چند روز کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف میں لے گیا، اور وہاں

دفن کر دیں، لیکن یہ غلط ہے، عبد الباقی نے جو خود عرفی کا معاصر تھا، مآثر رحیمی میں لکھا ہو کہ میرصابر اصفہانی نے جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ (وزیر اور خسر جہانگیر بادشاہ) کا درباری تھا ایک قلندر رکو، رقم کثیر دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے نجف لیجائے، بہر حال عرفی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی،

اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار   بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم

ملا رونقی ہمدانی نے اس واقعہ کی تاریخ میں یہ قطعہ لکھا،

یگانہ گوہر دریاے معرفت عرفی   کہ آسمان پے پرورش صدف آمد
بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم   زدہ است تیر دعاے وبر ہدف آمد
رقم زد از پے تاریخ رونقی کلکم   بکاوش مژہ از گور تا نجف آمد

اخلاق وعادات

عرفی کے اخلاق وعادات میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فخر، غرور، کم بینی، خود ستائی ہے، اس کے معتقدین خاص تک اس کے غرور سے نالاں ہیں، بدایونی نے فیضی کے توڑ پر اس کو بہت چمکایا ہے، تاہم یہ لکھنا پڑا،

"اما از بس عجب ونخوت کہ پیدا کردہ از دہا افتاد"

معلوم ہوتا ہے کہ اس رعونت نے تمام لوگوں کو اس کا دشمن بنا دیا تھا، ایک دفعہ بیمار ہوا (اور شاید یہ وہی مرض الموت کی بیماری تھی) لوگ عیادت کو آئے لیکن چونکہ دل صاف نہ تھے غمخواری کے لہجہ میں جو بات کہتے تھے اُس میں دل آزاری کا پہلو ہوتا تھا، عرفی بھی سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا، اسی حالت میں ایک قطعہ کہا جس میں مرض کی شدت بیان کرکے لوگوں کی ستم ظریفانہ بیمار پرسی کی تصویر کھینچی ہے، عرفی عالم تخیل کی بلندی سے نیچے نہیں آتا، لیکن اس قطعہ میں واقعہ نگاری اختیار کی ہو اور سماں باندھ دیا ہے

تن افتاد دریں حال و دوستانِ فصیح — بہ دورِ بالش و بستر ستادہ چوں منبر
یکے بہ ریش کشد دست و کج کند گردن — کہ روزگار وفا با کہ کرد ہا جانِ پدر
بہ جاہ و مال فرومایہ، دل نباید بست — کجا است دولتِ جمشید و نامِ اسکندر
یکے بہ نرمی آواز و گفت و گوی حزیں — کند شروع و کشد آستیں بدیدۂ تر
کہ جانِ من! ہمہ را ایں رہ ست و باید رفت — تمام راہ روانیم و دہر راکب بر
یکے بہ چرب زبانی سخن طراز شود — کہ اے وفات تو تاریخ انقلاب خبر
فراہم آی و پریشان مدار دل ز نہار — کہ نظم و نثرِ تو من جمع می کنم یکسر
پس از نوشتن و تصحیح می کنم انشا — بہ مدعاے تو دیباچہ چو درجِ گہر
چنانچہ ہستی فہرست دانش و فرہنگ — چنانچہ ہستی مجموعۂ صفات و ہنر
بہ نظم و نثر درآویزم و فرو ریزم — اگرچہ حصرِ کمالِ تو نیست حد بشر

ان سب کے جواب میں عرفی جل کر کہتا ہے،

خداے عزوجل صحتم دہد بینی — کہ ایں منافقگان را چہ آورم بر سر

نہایت حاضر جواب اور ظریف الطبع تھا، ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پر اس سے ملنے گیا، دیکھا تو ابوالفضل قلم دانتوں میں دابے ہوئے سوچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا، ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اُسی صنعت میں لکھ رہا ہوں، ایک موقع پر والد کا نام آگیا ہے، چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے، عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے، اپنے لہجہ میں مبارک لکھدیجئے (مبارک نام تھا، جس کو گنوار مبارک کہتے ہیں)

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا، عرفی عیادت کو گیا، فیضی کو کتوں سے بہت شوق تھا، چند

سگ بچے گلے میں سونے کے پٹے ڈالے پھر رہے تھے، عرفی نے کہا،

مخدوم زادہا بہ چہ اسم موسوم اند،

فیضی نے کہا بہ اسم عرفی، یعنی معمولی نام ہیں،

عرفی نے کہا مبارک باشد[1]

ظہوری سے اکثر دوستانہ خط وکتابت رہتی تھی، ایک دفعہ ظہوری نے کشمیر کی شال تحفہ میں بھیجی، غالباً شال معمولی درجہ کی تھی، عرفی نے جواب میں رقعہ لکھا، جس میں تین رباعیاں شال کی ہجو میں تھیں، ایک[2] یہ ہے،

ایں شال کہ وصفش نہ حد تقریر است	آیات رعونت مرا تفسیر ست
نامش نہ کنی قماش کشمیر کزد	صد رخنہ بکار مردم کشمیر ست

عرفی کی بد اخلاقی کے سب شاکی ہیں، لیکن تعجب ہے کہ فیضی نے جو اس کا سب سے بڑا حریف کہا جاتا ہے عرفی کی شریف النفسی کی نہایت تعریف کی ہے، چنانچہ اپنے رقعہ میں جس کی پوری عبارت آگے چل کر آئے گی لکھتا ہے،

"واز تہذیب اخلاق چگوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی"

شاید یہ ابتدائی ملاقات کا حال ہوگا جب فیضی کو پورا تجربہ نہیں ہوا تھا،

معلوم ہوتا ہے کہ عرفی بخلاف اور شعرا کے رند اور اوباش نہ تھا، کسی نے اس کو فسق کا الزام دیا تھا، اس پر اس کو سخت صدمہ ہوا، ایک قطعہ میں اس کا اظہار کیا ہے اور خاتمہ میں اپنے دل کو اس طرح تسلی دی ہے،

---

[1] یہ دونوں واقعات خافی خاں نے حالات اکبر واقعات ۱۰۰۱ھ ہجری میں لکھے ہیں (خافی خاں صفحہ ۲۰) دوسرا واقعہ بدایونی میں بھی مذکور ہے [2] خزانۂ عامرہ ذکر ظہوری،

اہلِ دنیا ہمگی تہمت گیرند و فساد　　عیسیٰ ایں را متحمل شد و مریم برداشت

باوجود بدمزاجی اور غرور کے عرفی نے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں کی، یا کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا ہوگا، ایک قصیدہ میں بہت جل کر کہا ہے تو صرف اس حد تک اکتفا کیا ہے،

با من از جہل معارض شدہ نامنفعلے

تصنیفات | نفسیہ تصوف میں ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے متعلق کوئی رسالہ ہے، مآثر رحیمی میں اس کی نسبت لکھا ہے،

"ورسالہ نیز موسوم بہ نفسیہ در نثر نوشتہ کہ صوفیان و درویشاں را سرلوحۂ دفتر تصوف و تحقیق می تواند شد"

مثنوی یجواب مخزن اسرار، دیوان کے ساتھ چھپی ہے،

مثنوی یجواب شیریں خسرو، آتشکدہ اور مجمع الفصحا میں اس کے اشعار نقل کئے ہیں،

کلیات قصائد و غزلیات، سنہ ۹۹۶ ہجری میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا، جس میں ۲۶ قصیدے، ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات اور رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی تھی،

ایں طرفہ نکات سحری و اعجازی　　چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی

مجموعہ طرازِ قدس، تاریخش یافت　　اوّل دیوان عرفی شیرازی

اس رباعی میں عجیب و غریب صنعت رکھی ہے، چوتھا مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے اس میں اکائیوں کے عدد لئے جائیں، تو قصائد کی تعداد کے موافق ہوتے ہیں یعنی ۲۶ دہائیوں کے عدد حساب کئے جائیں تو غزلوں کی تعداد کے برابر ہوتے ہیں یعنی ۲۷۰ اور سیکڑوں کو لیا جائے، تو قطعات اور رباعیوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے یعنی ۷۰۰، مختصر یہ کہ اسی مصرع میں تاریخ بھی ہے اور ہر قسم کے اشعار کی الگ الگ تعداد بھی،

یہ اخیر کا کلام ہے، اس سے پہلے چھ ہزار شعر کہے تھے، وہ بدقسمتی سے ضائع ہو گئے،
چنانچہ اس کے ماتم میں ایک پر درد غزل[1] لکھی جو دیوان میں موجود اور ذیل میں درج ہے،

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام — عمرِ در باختہ را بارِ دگر باختہ ام
ساقیِ مصطبۂ لطفم و می ریختہ ام — طائرِ باغچۂ قدسم و پر باختہ ام
العطش می زند از تشنہ لبی ہر مویم — کہ قدح ہائی پُر از خونِ جگر باختہ ام
صد شرع ہنر چوں نہ شود محو کہ من — شش ہزار آیت احکام ہنر باختہ ام

اسی رنج و غم میں دفعۃً بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے جوش میں آکر کہتا ہے، اور کیا
خوب کہتا ہے،

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست — از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

اس خیال کو کہ "اگر پچھلا کلام جاتا رہا تو مضائقہ نہیں پھر کہہ لونگا"، کس لطیف شاعرانہ
پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی "اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پروا نہیں، شکر ہے کہ بن کہا ہوا
تو موجود ہے"

مرنے کے وقت اپنا دیوان جو اُس کے ہاتھ کا مسودہ تھا عبدالرحیم خانخاناں کے کتبخانے
میں بھیجدیا تھا، کہ مدون کر دیا جائے، چنانچہ خانخاناں نے محمد قاسم مشہور بہ سراج کو اس
کام پر مامور کیا، سال بھر کی شبانہ روز کی محنت میں، دیوان کی ترتیب پوری ہوئی، کل چودہ ہزار
شعر تھے، خانخاناں نے اس محنت کے صلے میں سراج کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا،
قاسم نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر بھی کیا ہے،

عرفی آں واضع سخن کہ براو — رشک وارد، روانِ شروانی

[1] مآثر رحیمی

نہ کہ شروانی ست در رنگش — بلکہ ہم رونی و صفاہانی

بعد چندے چو جائے بودن نیست — رفت ازیں دیر شد فانی

ماند از وے ورق شاہوارے چند — کش قریں نیست بحری و کانی

صورتے چند جملہ با معنی — طفلے چند جملہ روحانی

لیک آں جملگی پراگندہ — ہمہ از بے سری و سامانی

آں قدر مہلتش نہ داد اجل — کہ بہ ترتیب شان شود بانی

گفت با دوستاں بہ گاہ وداع — کاے عزیزان جسمی و جانی

برسانید زادہائے مرا — بہ جناب معلم ثانی

صاحب حلم و علم و سیف و قلم — خان خاناں سکندر ثانی

دید چوں زادہائے عرفی را — ہمہ محمود و لعل پیکانی

بعد یک چند بندہ را فرمود — کہ وہم شان نظام دیوانی

مدتے چند خون دل خوردم — تا کہ جمع آمد از پریشانی

از خرد خواستم چو تاریخش — گفت ترتیب دادہ نادانی

ترتیب دادہ سے ترتیب کی تاریخ نکلتی ہے، عبد الباقی نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا ہے، جس میں عرفی کے حالات اور واقعات درج کیے ہیں، چنانچہ مآثر رحیمی میں اس کا ذکر کیا ہے، افسوس یہ نسخہ آج بالکل نایاب ہے، ورنہ غالباً بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں، صمصام الدولہ شہنواز خاں نے تذکرہ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی آخر ہاتھ آیا، اور دیوان میں داخل کر دیا گیا، لیکن جو نسخے اس سے پہلے شائع ہو چکے تھے وہ ناقص رہے، یہ بیان قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے، میں نے

عرفی کے دیوان کے نسخے باہم مختلف دیکھے ہیں، میرزا صائب نے اپنی بیاض میں عرفی کے اکثر اشعار انتخاب کئے ہیں، جو موجودہ دیوانوں میں نہیں ملتے،

کلام پر رائے

اس قدر مسلّم ہے کہ اصنافِ سخن میں سے عرفی مثنوی اچھی نہیں کہتا تھا، چنانچہ اس کے ایک معتقد خاص نے بھی تسلیم کیا،

مثنویش رنگِ فصاحت نداشت کان نمک بود و ملاحت نداشت

اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کلام میں جابجا خامی پائی جاتی ہے، لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے، اور آج تک تمام شعرا اس کی تقلید کرتے آتے ہیں، تاثر رحیمی میں ہے،

مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال مستعدان و اہل زبان و سخن سنجان تتبع او می نمایند

ایک عجیب بات یہ ہے اسکی شاعری کی شہرت قصیدے میں ہے لیکن وہ خود کہتا ہی،

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل ست

عرفی کی نسبت معاصرین شعرا کی رائے

میرزا صائب نے اس کا رتبہ نظیری سے کم قرار دیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری عرفی بہ نظیری نہ رساند سخن را

نظیری نے ایک ہم طرح قصیدے میں عرفی کے اشعار کا رد لکھا ہے، ہم اُن کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہو گا کہ نظیری جیسا شخص باوجود پوری کوشش کے عرفی کی شاعری پر اعتراض کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا،

دگر کہ گفت مباد از راوی شعرم دریں قصیدہ بروز کمال بنشانی
ترا کہ فضل بحدے بود کہ در بزمت طیور وقت ترنم کنند سحبانی

کمال جہل و بلاہت بود کہ طعنہ زند   بہ نقص پایہ کج فہمی و غلط خوانی

عرفی نے اپنے قصیدے میں کہا تھا کہ میرا قصیدہ کسی غلط خواں سے نہ پڑھوایا جائے ورنہ میرا بھی وہی حال ہوگا، جو کمال اسمٰعیل کا ہوا تھا، اس پر نظیری اعتراض کرتا ہی کہ خانخاناں کی مجلس میں جانور بھی سحبان ہیں، اس لئے یہ اندیشہ کرنا کمال حماقت ہی،

دگرنبود زشرط ادب در آوردن   بہ سلک مدح تو مدح حکیم گیلانی

گر او بہ فضل فلاطون ست برگزیدہ تست   بود بقرب کیان اعتبار یونانی

اگرچہ سایہ زرفعت زمیں فرو گیرد   وے نہد بہ پے آفتاب پیشانی

عرفی نے خانخاناں کے مدحیہ قصیدے میں حکیم ابوالفتح کی مدح بھی لکھی تھی، اس پر نظیری اعتراض کرتا ہے کہ ابوالفتح کی آپ کے سامنے کیا حقیقت ہے، وہ آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے اس لئے آپ کے ذکر کے ساتھ اس کا ذکر موزوں نہیں،

دگرچہ ابر درافشاں شود کسے نہ کند   کلاہ بادشہی را کلاہ بارانی

عرفی نے خانخاناں کی مدح میں لکھا تھا کہ ابوالفتح کے غصہ کا بادل جب برستا ہے تو لوگ تیری محافظت کی بارانی ٹوپی ڈھونڈھتے ہیں، نظیری کا یہ اعتراض ہے کہ خانخاناں کے بادشاہانہ تاج کو کلاہ بارانی نہیں کہنا چاہیے تھا،

اگرچہ کشور چین پر ز نقش مانی بود   خراب گشت نہ صورت بجاست نہ مانی

یہ شعر عرفی کے اس شعر کے جواب میں ہے،

ذخیرۂ نہد از من کہ مانی از صورت   تمتعے برم از وے کہ صورت از مانی

اعتراض یہ ہے کہ اب نہ مانی موجود ہے، نہ اسکی بنائی ہوئی تصویریں، اسلئے عرفی نے ممدوح کو مانی سے کیوں تشبیہ دی، ان اعتراضات کی جو وقعت ہو ناظرین خود اندازہ کر سکتے

ہیں، لطف یہ ہے کہ ان اعتراضات کے ساتھ نظیری نے خود اخیر میں عرفی کے تتبع کا قصد کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

بطرز وے دوسہ بیتے دگر ادا سازم — کہ بہر دعوئ او قاطع ست برہانی

عرفی کے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ نظیری جیسا شخص اسکی تتبع کا قصد کرتا ہے،

نظیری کو عرفی کے کمال سے انکار ہے تو ہو، لیکن ملک الشعرا فیضی اس کی نسبت ایک خط میں لکھتا ہے،

ازیاران دمساز وغمخواران ہمراز کہ دل از صحبت او آب می خورد مولانا عرفی شیرازی ست کہ دریں نوروز بہ قدوم خود بر خاک نشینان این دیار منت نہادہ اند بہ حق دوستی کہ ازین عظیم تر سوگندے نمی داند کہ بہ بلندی و وفور قدرت، و ایجاد معانی، وچاشنی الفاظ، وسرعت فکر و دقت نظر فقیر کسی راچون او ندیدہ و نشنیدہ، واز تہذیب اخلاق چہ گوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی' چند بیت از ایشان بالفعل حاضر بود در حاشیۂ این صحیفہ نوشتہ آمد"

بعد مردن ہیرے باد ابجاے خاکم — کہ فشانند مصیبت زدگاں برسر خویش

اے زلف عروس شادمانی شب تو — آرایش بزم بیغمی، مشرب تو

انباشتہ ہجراں بہ نمک داغ دلم — امانہ ازاں نمک کہ دارد لب تو

عشق آمد و رفت خوں چکاں در بازار — زہد آمد و کرد نقد تزویر نثار

آں ہینۂ داغ جست واین ہنیۂ گوش — زاں حبل متین تافتہ شد زین زنار

ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ "عرفی کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں کتب فروش بیچتے پھرتے ہیں، اور اہل عراق اور ہندوستانی تبرکاً لیتے ہیں"۔ اس سے بڑھ کر حسن قبول کی

کیا ویسی ہوگی،

عرفی کا کلام

عرفی کی عمر ۳۶ برس سے زیادہ نہیں ہونے پائی، ابوالفضل کی دراندازی نے اسکو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیا، تمام ہمعصر شعرا اس سے ناراض تھے، اس کے کلام میں کثرت سے ناہمواریاں اور خامیاں ہیں، ان سب باتوں پر بھی اکبری دور میں جس قدر اس کا نام روشن ہوا کسی کا نہ ہوسکا، اور اب بھی اس کے قصائد تمام ہندوستان کے مکاتب میں داخلِ نصاب ہیں، اس سے خود بخود قیاس ہوسکتا ہے کہ اس کے کلام میں ایسے جوہر ہیں، جن کی چمک کو کوئی چیز نہیں مٹا سکتی،

حقیقت یہ ہے کہ وہ طرز خاص کا موجد ہے، عبدالباقی جو خود اس کا معاصر ہے لکھتا ہے

"مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال درمیانۂ مستعدان واہل زماں معروف است وسخن سنجان تتبع او می نمایند"

اس کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

زور کلام

۱۔ زور کلام جس کی ابتدا نظامی نے کی تھی، عرفی نے اسکو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا، زور کلام ایک وجدانی چیز ہے جس کا اندازہ صرف مثالوں سے ہوسکتا ہے، مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کی شان وشوکت، بندش کی چستی، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت، مضامین کا زور، اس کے ضروری عناصر ہیں، عرفی کے کلام میں یہ تمام باتیں موجود ہیں، مثلاً

آہنیں پنجہ تیغش بہ اجل گفت کہ من   موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم

اگر نہیب دہد چرخ واژگوں گردد   دگر عتاب کند آفتاب خوں گردد

دوش بر دوش قضا دست در آغوش قدر   آمد از پردہ بروں پردگیِ صنع خدائے

چمن آید بہ چمن بہر تماشاے جمال　　　بلبل آید بر بلبل بہ تمناے غزل

مرحبا اے نظر بخت تو کیواں پرور　　　مرحبا اے گہر ذات تو امکاں آرا اے

ہر سر موئیش اگر باز شگافی بخرد　　　سومناتے ست کہ جیدست درو لات وہبل

اس مضمون کو کہ ممدوح بڑے بڑے سلاطین کو شکست دیتا ہے اس انداز سے ادا کرتا ہے،

رمح او گوید اگر جنگ گر صلح کہ من　　　بہ کشا د گرہ جبہۂ خاقاں رفتم

یعنی اس کا نیزہ کہتا ہے کہ لڑائی ہو یا صلح، میں ہمیشہ خاقان چین کی پیشانی کے بل کھول دیا کرتا ہوں

اس مضمون کو کہ میں معشوق پرستی کی وجہ سے ذلتیں اُٹھاتا ہوں یوں ادا کرتا ہے،

زاں شکستم کہ بہ دنبال دل خویش مدام　　　در نشیب شکن زلف پریشاں رفتم

دشمن کے مرعوب ہونے کو اس طرح ظاہر کرتا ہے،

ز رعشہ باطن خصمت چو جعد حور وشاں (زلف)　　　شکن بروے شکن خم بروے خم چیند

ممدوح کے جود و کرم، جاہ و جلال، حکومت و اقتدار کو یوں ادا کرتا ہے،

فارس حکمش بہ جولاں رفت و گفت　　　آفتابم گوست، چوگاں می زنم

یعنی اس کے حکم کا سوار میدان میں گیا اور بولا کہ آفتاب ایک گیند ہی جس سے میں کھیل رہا ہوں،

گفت جاہش دہر بر من تنگ شد　　　چاک در افلاک و ارکاں می زنم

یعنی اُس کے دبدبہ نے کہا کہ زمانے میں اب میں سما نہیں سکتا، اس لئے افلاک اور عناصر کو چاک کئے دیتا ہوں،

گفت جودش سیم و زر در کان نماند　　　سکہ بر پیشانی کان می زنم

یعنی اُس کی سخاوت نے کہا کہ چاندی اور سونا کان میں نہیں رہا، اس لئے

خود کان کی پیشانی پر سکہ لگاتا ہوں،

اس بات کو کہ اگر ممدوح کے خلافِ مزاج کوئی شخص بات کہے، تو فوراً واپس لے گا، یوں ادا کرتا ہے،

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود ‏ ‏ ‏ از در گوش سراسیمہ بلب گردد باز

یعنی کہ جو بات کہ اس کے سامعہ کے خلافِ مرضی ہو، وہ کان تک اگر سخت بدحواسی کے ساتھ بولنے والے کے ہونٹوں کی طرف پلٹ جائے گی،

اس بات کو کہ حریف کس برتے پر میرا مقابلہ کر سکتا ہے، اس طرح ادا کرتا ہے،

خصم و طرز سخنِ من، بچہ فہم و بچہ درک ‏ ‏ ‏ غیر و نظم گہرِ من، بچہ برگ و بچہ ساز

ممدوح کی تحریض، اور نعرۂ جنگ سے بہادری کے عام اثر پیدا ہو جانے کو اس طرح ادا کرتا ہے،

اگر بصحن چمن فی المثل شجاعت او ‏ ‏ ‏ دہد نہیب کہ ہیں یاسمین دہاں نرگس

چو عکس لالہ زند یاسمین در آب آتش (ق) ‏ ‏ ‏ چو شاخ بید کشد خنجر از میاں نرگس

یعنی اگر اس کی شجاعت باغ میں ڈپٹ کر چنبیلی اور نرگس سے کہے کہ ہاں لینا، تو چنبیلی لالہ کے عکس کی طرح پانی میں آگ لگا دیگی، اور نرگس، بید کی شاخ کی طرح کمر سے تلوار کھینچ لے گی،

نہیب، ہیں، وہاں، آتش در آب زدن، خنجر از میان کشیدن، یہ الفاظ اور عکس لالہ اور شاخ بید کی تشبیہ ان سب باتوں نے مل کر کلام میں کس قدر زور پیدا کر دیا ہے،

چونکہ اس کا کلام عموماً پر زور ہوتا ہے، اس لئے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا، آگے اور عنوانوں کے ذیل میں جو اشعار آئیں گے ان پر زورِ کلام کی حیثیت سے بھی نظر ڈالنی چاہئے،

۲- الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں، عرفی نے سیکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کیے جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے، مثلاً

خیز و شراب حیرتم زاں قدِ جلوہ ساز دہ   بڑے بڑے حسن کن دست بدست ناز دہ

مریمی کن تو کہ فرزند مسیح است و مسیح   حاتمی کن تو کہ اقبال گدای ست و گدا

مرحبا اے زعنایاتِ ازل رمز فروش   مرحبا اے بہ علاماتِ ہنر خویش ستاے

ناخنِ قدرتِ او پردۂ تحقیق شگاف   خامۂ دولتِ او چہرۂ توفیق کشاے

گُل اندیشۂ من، سحر غلط معجزہ رنگ   بلبل نطق من، الہام غلط وحی سرائے

بہ برُقع مہ کنعاں کہ بود حسن آباد   بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار

بہ تیشہ کہ بر اطراف صورتِ شیریں   ہمہ کرشمہ تراشیدہ و ریخت بر کہسار

بہ نجل وعدہ تراش و قناعت عیاش

کہ گر شود رہِ کوی تو جملہ نشتر خیز   کنم بہ مردمکِ دیدہ طے نشتر زار

بہ روش مہر فزا و بہ نگہ صبر گداز

یہ ترکیبیں جس قدر بدیع ہیں اسی قدر مضمون میں زور اور وسعت پیدا کرتی ہیں، فرض کرو اگر یہ کہنا چاہیں کہ مجلس میں کثرت سے خوش جمال جمع تھے تو یہ مضمون جس وسعت کے ساتھ صرف اس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے کہ "مجلس یوسف کدہ بن گئی تھی" سیکڑوں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا،

اسی طرح نشتر خیز، معجزہ رنگ، رمز فروش، کیواں پرور، مکان آرائے، حسن آباد، صبر گداز وغیرہ ترکیبوں سے مضمون میں جو زور، وسعت، اور رنگینی پیدا ہوتی ہے، محتاج اظہار نہیں، اسی قسم کی ترکیبیں، متوسطین اور متاخرین کی خاص ایجاد ہیں، عرفی اگر ان کی ایجاد کا خدائے یکتا

نہیں تاہم قدا ضرور ہے،

جدت استعارات و تشبیہ ۳۔ عرفی کے کلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت استعارات کی جدت اور طرفگی ہے، یہ مسلم ہے کہ انشاپردازی اسی قدر لطیف اور پُرزور ہوگی جس قدر استعارات، لطیف اور پرزور ہوں گے، عرفی نے استعارات کی جدت اور تنوع سے ایک گوناگوں عالم پیدا کردیا، ان میں بعض بے مزہ اور دوراز کار ہیں، جیسا کہ صاحب آتشکدہ اور مجمع الفصحا کا خیال ہے، لیکن زیادہ تر ایسے ہیں، جو ایوانِ شاعری کے نقش و نگار ہیں مثلاً

میر ابوالفتح کز سیاستِ او — غمزۂ زہرہ، خنجر اندازد
زاں طفلِ اشک من ہمہ خوں شد کہ اوفتاد — دوش از دریچۂ دل و امشب زبامِ چشم
دلم چو رنگِ زلیخا شکستہ در خلوت — غمم چو تہمتِ یوسف دویدہ در بازار
بر چہرِ رُمحِ تو در آشوب گاہِ معرکہ — لیلۃ القدرے ست در ہنگامۂ یوم الحساب

ع بہ بر شگفتن امروز و غنچہ گشتن دی،

یعنی آج کا دن گویا ایک پھول ہے، جو کھل رہا ہے، اور کل کا دن کھل کر مرجھا گیا اور غنچہ بن گیا،

بہ خوی فشانی شبنم بہ خود فروشی گل — بہ نیزہ بازی سوسن بدشنہ سازی خار
زنور ناصیہ ات ماہ گر ضیا گیرد — بہ آفتاب دہد نسخۂ سنین و شہور

ع، چو صبح، بیضۂ خورشید پرورد بہ شکم،

ع، کہ تا بہ پیدن سرپنجۂ مرجاں رفتم، (پنجہ مرۃ وزنا)

بزم گاہ تو حجلۂ یوسف — رزم گاہِ تو شانۂ ضحاک
دست مظلوم را چو کرد دراز — صد شبیخوں بہ شعلۂ زد خاک

از خم مدت تو جام نخست — جرعۂ دور آخر افلاک

یعنی تیری درازی عمر کی شراب کا پہلا جام آسمان کا اخیر دور ہے،

حلۂ لفظ برقد معنی — صدر وش دوختی و کردی چاک

آسمان دریوزہ کردہ آفتابش کردہ نام — لعلے از آویزۂ گوش شب یلدائے من
خوردہ ہر دم صد شکست از فوج قدس آشوب حسن — شوق بے ہنگام نازست بے پروائے من

مسلسل مضامین ۴۔ عرفی کا زور طبع، اور فصاحت و بلاغت کا زور و شور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصائد میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے، اور یہ اس کا خاص انداز ہے مثلاً خانخاناں کے بیٹا پیدا ہونے پر جو قصیدہ لکھا ہے، اس کی تمہید اس طرح شروع کی ہے،

بود در کتم عدم بکر طبیعت را جائے — کہ خرد بر سرش استادہ ہمی گفت برائے
چند در پردہ نشیند خلف دودۂ کون — محرمی نیست مگر ہم تو شوی پردہ کشائے
مریمی کن تو کہ فرزند مسیح ست و مسیح — حاتمی کن تو کہ توفیق گدا می ست و گدائے
این سخن گوش زد بکر طبیعت چوں گشت — خندہ زد گفت کہ رو صبر کن و ژاژ مخائے
گوشہ گیر و جگر می خور و تلخی می کش — تا بعہدے کہ شود صاحب تو ملک آرائے
خلق از مژدہ بر مژدہ شنو جمع شوند — ہمہ جوہر طلب و جوہری و گنج ستائے
فلک آمادہ شود زہرہ مہیا گردد — آں یکے حلہ طراز آید و ایں غالیہ سائے
من بصد ناز و کرشمہ ہمہ رنگ و ہمہ بوئے — بر سر حجلۂ ارکان نہم از خلوت پائے
پس در آید بہ برم آں کہ بنقش نام زدم (جس کے میں نامزد ہوں) — او کشد بند نقاب من (عناصر) و من بند قبائے

نعت کی تمہید اس طرح لکھتا ہے،

آمد آشفتہ بخوابم شبے آں مایۂ ناز — بہ روش جلوہ فزا و بہ نگہ صبر گداز

چه پری چهره نگارے که ندارد شلش   در پس پردهٔ فطرت فلک لعبت باز

دیدم القصه که خوش گرم عنان ست روان   سودم اندر قدمش چهره بصد عجز و نیاز

گفتم اے عربده جو چیست گناہم؟ که دگر   به تعرض همه خشمی، به تغافل همه ناز

گفت این خود نه گناه ست که ساکت شدهٔ   از ثنا گستریِ شاه سر بر اعجاز

منفعل گشتم و فی الحال به وادی مدیح   مرکب طبع جهاندم، به هوای تگ و تاز

ره نبردم به سر کشور معنی هر چند   که دران بادیه راندم، به نشیب و به فراز

گریه آلوده فتادم دگر اندر قدمش   گفتم اے مایهٔ آرام دلِ اہل نیاز

از جبین چین بگشا تا دل من جمع شود   که سراسیمه کند مرغ خیالم پرواز

این سخن در دلش از درد اثر کرد و سرم   برگرفت از قدم خویش و بلطف آمد باز

بے حجابانه زدم بوسه بدستش از شوق   گفتم اکنون ده اجازت که شوم وحی طراز

جہانگیر نے شاہزادگی کے زمانہ میں عرفی کا شہرہ سُن کر دربار میں بلایا، چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا، ہمہ تن شوق اور بے تابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہِ لطف سے دیکھا اور اشاروں میں باتیں کیں، پھر مسکرا کر قصیدے کی فرمائش کی، اس دلچسپ داستان کو قصیدۂ مدحیہ میں ادا کرتا ہے،

صباح عید که در تکیه گاهِ ناز و نعیم   گدا کلاهِ نمد، کج نهاد و شه دیهیم

جهان چنین خوش و من خوشتر انجنان و ثاق   نشسته با خرد اندر تعلّم و تعلیم

که ناگهان ز درم در رسید مژده دہے   چنان که از چمن طائر ز مغز شمیم

چه گفت؟ گفت که اے مخزنِ جواهر قدس   چه گفت؟ گفت که اے مطلب بهشت نعیم

بیا که از گهرت یاد می کند دریا   بیا که تشنه لبت را طلب کند تسنیم"

یعنی جہانگیر   چشمۂ بہشت کا

ازیں پیام دلم شد شگفتہ و شاداب — چنانکہ باغ ز شبنم چناں کہ گل ز نسیم
بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ — کہ دستِ اہلِ کرم در نثار گوہر و سیم
چو روزگار رسیدم بہ درگہے کہ کند — زمانہ طوفِ حریمش بہ دیدۂ تعظیم
رسیدنِ من و اقبال آں ہمایوں فال — چناں فتاد مطابق دراں خجستہ حریم
کہ گر ادب نکشندی عنانِ من قدمش — ببوسہ گاہ ہمی کرد بر لبم تقدیم

یعنی میرا وہاں پہونچ کر زمین بوسی کے لئے گرنا، اور شاہزادہ کا سامنے سے آنا اس قدر مطابق پڑا کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجاے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے اس کے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد — بہ لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
رموزِ کورنش و تسلیم را ادا کردم — بہ داب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر انچہ گفتن داشت — کہ در بیان نگنجش کرد بر زبان تقدیم

یعنی اُس نے کچھ نہیں کہا لیکن میں نے سن لیا، کیونکہ اظہار مطلب میں اسکی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی، مطلب یہ کہ پہلے اشاروں میں باتیں ہوئیں،

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

یعنی جب ہونٹوں کی باری آئی (یعنی اس نے تقریر شروع کی) تو میرا سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا،

بخندہ گفت کہ در عذر ایں گناہ بزرگ — کہ رفتہ نام تو بے حکم ما بہ ہفت اقلیم
ہمیں کہ رفتی ازیں آستاں نوشتہ بیار — گزیدہ نسخہ از زادہ ہاے طبعِ سلیم

ابو الفتح کے دربار میں جب ملازمت کا تعلق کرنا چاہا ہے تو قصیدہ لکھکر دے گیا ہے،

اور عجیب لطیف پیرایہ میں اپنی ملازمت کی خواہش ظاہر کی ہے،

خدایگانا! دارم حکایتے بر لب   کہ چوں مدیح تو نتوانم بہ لب استاد

خیالِ بندگیت دوش نقش می بستم   ز روئے کسبِ شرف نے ز روئے استعداد

کہ ناگہ از درِ اندیشہ خانہ شاہدِ عقل   کہ شمعِ خلوتِ اسرارِ مبدءست و معاد

کرشمہ سنج و تبسم کناں در آمد و گفت   کہ عید بندگیِ صاحبت مبارکباد

من از تعجب ایں حرفِ دلکشا گفتم   کہ اے ز لطفِ کلامِ تو ملکِ ہزل آباد

نہ آسمانم و نے آفتاب نے بہرام (عطارد)   کزیں مطایبہ (ظرافت) گردم ز سادہ لوحی شاد

تو ہم ز حرفِ تنک مایہ تر زباں نشوی   بگو کہ صورتِ ایں مژدہ از چہ معنی زاد؟

جواب داد کہ ایں مژدہ را دلیلے ہست   کہ دستِ فطرتم آں را بطاقِ حصر نہاد

ہمیں نفس ادب آموزِ قدسیان جبریل   دریچۂ حرمِ قدس را بدیدہ کشاد

بسوئے کاتبِ اعمال بانگ بر زد و گفت   کہ اے رقم کشِ کردار خوب و زشتِ عباد.

بسوئے نامۂ عرفی کہ ایزدِ متعال   ز بندگانِ خودش برگزید و کرد آزاد

اگر نہ بندگیِ صاحبت بہ فال آمد   سبب چہ بود کہ جبریل ایں ندا در داد

من از متانتِ بُرہاں بشرم غوطہ زدم   شکست بر رخِ اندیشہ رنگِ استعداد

بخدمت آمدم اینک بگو چہ مصلحت است   بر آستانِ تو باید نشست؟ یا استاد

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے، ابو الفتح کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے مخدوم! کل میں آپ کی نوکری اور ملازمت کا خیال دل میں پکا رہا تھا وہ بھی اس بنا پر نہیں کہ میں اس قابل ہوں بلکہ اس لئے کہ یہ میری عزت کا سبب ہے، اسی حالت میں عقل نے مجھ سے آکر کہا کہ تو مبارک، تم سرکار میں ملازم ہو گئے، میں نے متعجب ہو کر کہا کہ میں آسمان اور عطارد کی طرح سادہ لوح

نہیں کہ اس مذاق پر یقین کروں گا، آخر اس کا کوئی ثبوت بھی عقل نے کہا ابھی ابھی جبریل نے حرم قدس کے دریچے کھولے اور کاتب اعمال کو حکم دیا کہ عرفی کا نامۂ اعمال دھو ڈالو، کیونکہ خدا نے اس کو اپنے برگزیدہ بندوں میں داخل کر لیا، میں اس دلیل کی متانت سے شرمندہ ہو گیا، اور اب خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں، کیا ارشاد ہے؟ آستانہ عالی پر بیٹھنے کی اجازت ہے یا مودب کھڑا رہوں،

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں اس کے کلام میں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو کس ترتیب اور کس تسلسل اور شاعرانہ انداز سے ادا کر سکتا ہے،

۵- قصائد میں شعراء کی یہ مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی مدح وثنا کے سوا اپنا ذکر کر سکیں اور کبھی ایسا کرتے تھے تو صرف اپنی بیچارگی اور بیکسی کا اظہار کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ حضور اور شعراء کی زیادہ قدر کرتے ہیں، حالانکہ میں اُن سے بڑھ کر ہوں، عرفی چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خود دار تھا، اس لئے مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے امراء اور سلاطین کی مدح کرتا تھا، لیکن ساتھ ہی اپنے فضائل اور اوصاف بھی جی کھول کر بیان کرتا، اور مزے لے لے کر کہتا تھا، شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو، جس میں ایک دو شعر فخریہ نہ ہوں، شہزادہ سلیم کی مدح میں خودستائی کا بالکل موقع نہ تھا، تاہم کہتا ہی،

خدا یگانا! گویم بہ مدح خویش دو بیت | کزاں بنار د پرہیز کرد طبع سلیم

(یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کم سے کم دو شعر بھی اپنی مدح کے نہ کہوں، اسکے بعد دو شعر فخریہ لکھے ہیں)

اہل ادب نے انواع شاعری میں فخریہ کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے، فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں، عجیب عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے، اور اس جوش سے لکھتا ہی کہ آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، ایک قصیدہ میں ممدوح کو خطاب

کر کے کہتا ہے عرفی کا غرور اب حد سے بڑھ گیا، آپ کبھی اس کے شعروں کی تحسین نہ کیجئے، پھر اپنی تمام خوبیوں کو عیب کے پیرایہ کے بہانہ سے ذکر کر جاتا ہی،

داد یک شہر ز عرفی بستاں کیں مغرور / کبر و نازش بہ اندازۂ قدرست محل

نیم تحسیں مکن ار گوید صد بیت بلند / کہ دماغش شدہ از حسن طبیعت مختل

عرفی اگر سیکڑوں عمدہ شعر کہہ جائے تب بھی اسکی تعریف نہ کیجئے، کیونکہ اس کا دماغ حسن طبیعت کے غرور سے مختل ہوگیا ہے،

ہر سر موئیش اگر باز شگافی بخرد / سومنا تیست کہ چیدہ ست درو لات ہبل

عرفی کا ایک ایک بال چیر کر دیکھا جائے تو ایک سومنات نظر آئیگا جسمیں بت چنے ہوئے ہیں

بہر اصل و نسب خویش نوسید بیروں / ہر چہ خواہد ز نسب نامۂ ارباب دول

عرفی تمام ارباب دول کے نسب نامے، اپنے نسب میں ملا لیتا ہے،

گوہر آمای رموز ست نہ دریا و نہ کان / حکمت آموز عقول ست و نہ علم و نہ عمل

نہ دریا ہے نہ کان باوجود اس کے دعویٰ کرتا ہو کہ راز کے موتی میرے خزانہ میں ہیں، نہ علم ہے نہ عمل، باوجود اس کے عقول عشر کو حکمت سکھاتا ہے،

چہ بلا عیب تراشم کہ حسد کم بادا / مشنو عیب نہ رو ہر ہی از سیم و غل

میں کس بلا کا عیب جو ہوں، آپ خالص سونے کا عیب، کھوٹی چاندی سے نہ سنئے،

انچہ ذرات معانی ست کہ بروے جوشند / ہمہ خورشید شود گر شناسند محل

مضامین کے ذرے جو اسکے دل میں چمکتے ہیں وہ اگر اپنا رتبہ پہچانیں تو سب آفتاب بن جائیں

دار د از عزت اصل گہر و ذلت شعر (خاندان) / پائے در تحت ثریٰ و ست در آغوش زحل

یعنی خاندانی اعزاز اور شعر کی ذلت کی وجہ سے اس کے پاؤں تو تحت الثریٰ میں ہیں، لیکن ہاتھ

زحل کی آغوش میں ہے،

عزت او نہ شہیدی ست کہ حشرش باشد — ورنہ نگریستے از ستم مدح وغزل

اگراو نامزد ننگ شد از ذلت شعر — شعر از عزت او ینک بر آید ز ذلل

یعنی عرفی تو شعر کی وجہ سے ذلیل ہوا لیکن فنِ شعر معزز ہوگیا،

اکبر کے دربار میں خود ستائی کی کس کو جرأت ہوسکتی تھی تاہم کہتا ہے،

شہا! بہ بزمِ تو چوں ایں قصیدہ برخوانم — کہ ملک نظم زفیضش گرفتہ است نظام

سرزد بجایزہ باجیب پُر گہر گردوں — بہ دوشم افگند ایں جامۂ زمرد فام

عرفی نے قصائد میں جس قسم کی خودداری کے خیالات کی ابتدا کی تھی، اگر اسکی طرف عام خیالات کا میلان ہوگیا ہوتا تو شاید یہ صنف کسی اچھے کام کا مصرف بن جاتی،

مضمون آفرینی

۷۔ عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے اقرار کرلیا ہے، اس میں مطلق شبہہ نہیں ہوسکتا کہ اُس کی قوتِ تخیل نہایت زبردست تھی، لیکن اس زمانہ کا مذاق تھا کہ یہ قوت صرف مبالغہ، جدتِ تشبیہ اور حسن تعلیل وغیرہ پر صرف کیجاتی تھی، عرفی کا زور بھی انہی فضول چیزوں پر ضائع ہوا تاہم جو نمونے موجود ہیں ان سے یہ قطعی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر اس سے بجا طور پر کام لیا جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں،

آں کہ چوں در کنف چترِ ہمایوں آثار — ہم عناں ظفر از راہ غزا گردد باز

زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشاں — از کاوش کہ پذیرفتہ غبار از تگ وتاز

فتح گوید چہ کنی چشم من است ایں نہ رکاب — سرمۂ چشم جہاں بین مرا پاک مساز

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چتر کے سایہ میں میدان غزا سے واپس آتے ہیں تو

زہرہ چوٹی کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑگئی ہے اس کو جھاڑ دے، فتح کہتی ہے این! یہ کیا کرتی ہے؟ یہ رکاب تھوڑی ہی ہے یہ تو میری آنکھیں ہیں، اس کے سرمہ کو (گرد کو سرمہ قرار دیا ہے) کیوں چھڑاتی ہے،

احتساب تو اگر عارض نہی افروزد | ای سراپردۂ عصمت تو با زینت و ساز
زخمہ ہر چند کہ انگشت نہد بر لب تار | نغمہ از بیم نیارد کہ برآرد آواز

یعنی اگر آپ کا احتساب ظہور میں آئے تو مضراب گو کتنا ہی تار کو چھیڑے لیکن نغمہ کبھی ڈر کے مارے آواز اونچی نہ کرسکے،

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود | از در گوش سراسیمہ بلب گردد باز

گھوڑے کی تعریف

وحش اقتد ز شبگیر سمند تو کہ ہست | در دہانِ کس از شوخیِ ادمت اصل
سبحان اللہ گھوڑا
آں سبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی | از ازل سوے ابد و ز ابد آید بہ ازل
قطرہا کش دم رفتن چکد از پیشانی | شبنم آسا نشنیند گہ رجعت بہ کفل

یعنی گھوڑا اس قدر تیز رفتار ہے کہ اگر تو اس کو دوڑائے تو ازل سے ابد اور ابد سے ازل تک کا چکر اتنی دیر میں لگا آئے گا کہ جاتے وقت اسکی پیشانی سے جو قطرے ٹپکیں گے وہ واپسی میں اس کے پٹھوں پر ٹپکیں گے اور زمیں پر نہ گرنے پائیں گے،

طرز ادا کی جدّت

عرفی جدتِ ادا کا گویا موجد ہے، اور اس کا ہر شعر جدت کی ایک نئی مثال ہے، جو اشعار اوپر گذر چکے اُن میں بیسیوں مثالیں ملیں گی، اس لئے ہم صرف چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں،

مو بمویم دو ست شد ز تر سم کہ استیلاے | یک انا الحق گوے دیگر بر سر دار آورد
اے برہمن چہ زنی طعنہ کہ در معبد ما | سبحہ نیست کہ آں غیرتِ زنّار تو نیست

در دل شکنی آفتِ دہر ست نگاہش — طفلے کہ بپیری شکند طرفِ کلاہش

ساقی توئی و سادہ دلی بین کہ شیخِ شہر — باور نمی کند کہ ملک می گسار شد

زخمہا بر داشتیم و فتح ہا کردیم لیک — ہرگز از خونِ کسے رنگین نشد دامانِ ما

فارغ ز خیرگی نگرد روے آفتاب — این دیدہ آزمودۂ نظارۂ کسے ست

گوش معزول ست در خلوت گہِ اربابِ راز — دودِ شمعِ خلوتِ ایشان بہ روزن دشمن ست

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند — کہ خرقۂ خشتم (متوبا) یایۂ طلا باف ست

ایماد اشارت نہ باندازۂ راز ست — این رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز ست

نسبت سبحہ و زنار دو صد رنگ آمیخت — ورنہ این رشتہ ہمان ست کہ آدم می رشت

عشق اگر غم داد و جانُ دل شدہ عیش بمن — بیعِ اوّل بود و آشوبِ خریدارے نبود

زنند طعنہ بمجبر بہشت جویاں را — کہ این گروہ رعایاے ہمت پستند

شہید مضطربے خاک شد، مگر برہت — بے نسیم براہِ تو گردے خیزد

ہلاک جوہرِ شمشیرِ نازِ خوبانم — کہ تا ز زخم جدا گشتہ زنگ می گیرد

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن — بخوشہ چینیِ آئینہ کم نمی گردد

دل نشد فرزانہ و عقل از فسوں دلگیر شد — بر جنوں افزودمش تا قابلِ زنجیر شد

فسانہا کہ ببازیچہ روزگار سرود — کنوں بہ بند جمشید و تاج کے بستند

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند — بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

کلید میکدہ ہا را بمن دہید کہ من — نہ آں کسم کہ باندازہ مست می گردد

چہ بطاعت طلبی، برہمناں را زاہد! — تو ریا ورز کہ این طائفہ کارے دارند

بساطی کاندر و طرحِ دو عالم می تواں کردن — بدست آوردہ ام اندازۂ پرکار می باید علوِ ہمت

به طور ما نه گنجد، منع دیدار
ولے ایں راز، با موسیٰ بگویید

دہر مرد افگن به میدانم کند تکلیف ومن
ایں متاع افتاده بر بالاے بستر می خوم

صدق دوستی

مہر پیمائی مجو از من که من ایں جنس را
غائبانه می فروشم، در برابر می خرم

تمام بود بیک حرفِ گرم دما غافل
حکایتے که همه نا تمام می گفتند

بلند ہمتی

به آفتاب از آن ذره را در اندازند
که عذر مردم کاہل به نا کسے نه نهند

مو بمویم رشته زنار شد واز نا کسے
در خراباتِ مغاں بد نام اسلامم ہنوز

عشقیہ شاعری

عرفی ایک طرف تو نکتہ سنج اور نکتہ شناس اور ذوقِ عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظر رہ چکا تھا، ہندوستان میں آیا تو شہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا، ان اسباب کی بنا پر وہ عشق اور محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا، وہ کہیں عشق حقیقی کے اسرار اور دقائق بیان کرتا ہے، اور کہیں مجازی عشق میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں، ان کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنے تمام ہمعصروں سے اس بات میں ممتاز ہے، کہ وہ سطحی اور سرسری وارداتیں نہیں بیان کرتا بلکہ گہرے اور دقیق معاملات پر اسکی نظر پڑتی ہے اور انہی کو شاعرانہ انداز میں ادا کرتا ہی،

شوقِ دیدار میں عاشق ہمہ تن نظارہ بن جاتا ہے، اس حالت کو یوں ادا کرتا ہی،

چگونه مانعِ نظاره ام شوی که مرا
ز شوقِ روے تو سر تا قدم نگه خیزست

استیلاے عشق کی حالت میں ہر قسم کے عام جذبات بھی عشق ہی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً عشق کی حالت میں اگر کوئی دنیوی صدمہ بھی پیش آتا ہے تو وہی مزہ دیتا ہی، جو عشقیہ صدمات سے حاصل ہوتا ہے، اس حالت کو ادا کرتا ہی،

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
باده گر خام بود پخته کند شیشهٔ ما

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوقوں کے سامنے جب کوئی ان کا ناز بردار نہیں ہوتا تو آپ ہی آپ بگڑتے ہیں اور گویا خود اپنے آپ پر ناز افشانیاں کرتے ہیں، اس مخصوص اور مخفی حالت کو بیان کرتا ہے،

فغاں زغمزۂ شوخی کہ وقتِ تنہائی　　بہانۂ بخود آغاز کردہ در جنگ ست

جوشِ حسن میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوق آئینہ دیکھ کر، خود اپنے آپ کو پیار کرنے لگتا ہے اس حالت کو دکھاتا ہے،

دہنِ خویش بیوسند دلبِ خویش مکنند　　چوں در آئینہ بینند بتاں صورتِ خویش

معشوق لطف اور نوازش کے ذریعہ سے عاشق کا دل مسخر کر سکتے ہیں لیکن عموماً وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ ظلم پسندی کی وجہ سے اس کے بجائے ناز اور قہر و عتاب سے کام لیتے ہیں، اس معاملہ کو عجیب لطف سے بیان کیا ہے،

بہ ملک ہستی من رو نہادہ سلطانی　　کہ ما بصلح دہیم او بجنگ می گیرد

یعنی ہمارے ہستی کے ملک پر ایسے بادشاہ نے چڑھائی کی ہے کہ ہم صلح سے دیتے ہیں لیکن وہ خواہ مخواہ لڑ کر لیتا ہے،

معشوق یوں تو ہر وقت جلوہ فروشی کیا کرتے ہیں، لیکن کوئی تقاضا کرے تو رُک جاتے ہیں اور ترساتے ہیں، اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

حُسن را از شیوہ ہا گاہے بود میلے بناز　　ورنہ موسیٰ بے طلب صد رہ تماشا کردہ بود

عاشق ہجر کے زمانہ میں معشوق کی ایک ایک بات اور خصوصاً اُسکی معشوقانہ نگاہوں کو حافظہ کے خزانے سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہے اور اُس سے مزے لیتا ہے یا اس پر حسرت کرتا ہے، اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے،

ہر مناعے کز نگاہش می خرم در روز وصل
می نشینم گوشۂ و از خود مکرر می خرم

ابتدائے عشق میں ہمہ وقت جوش اور درد و گداز ہوتا ہے اسکی تصویر کھینچتا ہے،

عشق ئی گویم و می گریم زار
طفل نادانم و اول سبق ست

معشوق سے خواہش کرتا ہے کہ ستانا ہے تو ہم کو ستا کہ ہم پہلے ہی سے زخمی ہیں
اور ہمارے ستانے میں تجھ کو اور خود ہم کو زیادہ مزہ آئے گا،

ہرگاہ کہ از لطف بکیں میل تو بیش ست
اوّل نمک سینۂ ما پاش کہ ریش ست

یعنی چونکہ تمھارا میلان بہ نسبت لطف کے ظلم کی طرف زیادہ ہے اس لیے پہلے
ہمارے سینہ پر نمک چھڑکو کہ وہ پہلے ہی سے زخمی ہے،

معشوق اگر ہمیشہ ظلم اور بے اعتنائی ہی کیا کرے، تو عاشق اس کا خوگر ہو کر ایک
اطمینانی حالت پیدا کرلے، لیکن مصیبت یہ ہوتی ہے کہ معشوق کبھی کبھی لطف اور نوازش
کی بھی چاشنی چکھا دیتے ہیں، اس کے بعد سرد مہری اور زیادہ چرکے دیتی ہے، اس
کیفیت کو ادا کرتا ہے،

ازاں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم
کہ شیوہ ہاے ترا باہم آشنائی نیست

یعنی اس لئے ہر وقت میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار رہتا ہوں کہ تیری ادائیں
ایک دوسرے سے نہیں ملتیں،

شفائی نے اس مضمون کو زیادہ صاف اور واضح کردیا ہے، لیکن وہ ابہام کا مزہ
جاتا رہا، وہ کہتا ہے،

ایں جور دگر ست کہ آزارِ عاشقاں
چنداں نمی کند کہ بہ بیداد خو کنند

معشوق جب بلند پایہ ہوتا ہے اور وہاں تک رسائی ناممکن ہوتی ہے تو عاشق

اپنی پستی حالت کا اندازہ کرتا ہے اور اس وقت یہ رنج کم ہو جاتا ہو کہ دیدار سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، عرفی اس حالت کو حسرت کے لہجہ میں دکھاتا ہے،

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حسنِ بلند — کہ دلم داغ ازحسرت دیدار تو نیست

نہ باندازۂ بازو ست کمندم ہیہات — ورنہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست

معشوق کی عام دلفریبی کو یوں ظاہر کرتا ہے،

یارب تو نگہ دار دلِ خلوتیاں را — کان مغبچہ مست ست و درِ صومعہ باز ست

ناز کی بے اعتنائی کا مضمون کس خوبی سے پیدا کیا ہے،

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیلؑ — در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

یعنی حضرت اسمٰعیلؑ

بیگانوں کے ساتھ معشوق کی صحبت بدمزہ ہے،

میروی باغیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم — لطف فرمودی برو کیں پائے ارفتار نیست

یعنی غیروں کے ساتھ جا رہے ہو اور کہتے ہو کہ عرفی تو بھی آ، آپ کی عنایت لیکن مجھ سے چلا نہیں جاتا،

عشق میں عقل اور سمجھ سے کام لینا نہیں چاہئے،

گفتگو ہائے حکیمانہ نیا لاید عشق — بگذارید کہ ایں نکتہ مُسلم باشد

حسن کی رونق عشق سے ہے اور عشق کی حسن سے،

ایں صفا عشق و محبت زہم اندوختہ اند — ایں دو شمعے ست کہ ازیکد گرا فروختہ اند

تھوڑا سا غم، دل کی عالی ظرفی کے قابل نہیں اور زیادہ سما نہیں سکتا،

فریاد کہ غم ہائے تو در سینۂ تنگم — اندک بنود لائق و بسیار نہ گنجد

اب ہم عرفی کے ہر قسم کے چند عشقیہ اشعار درج کرتے ہیں،

وہ کہ از دوختن ایں چاک گریباں رفتہ ست — ایں شگافے ست کہ تا دامن ایماں رفتہ ست

رفت آں آفت جاں از برم اے ہوش بیا — تا بینیم کہ چہا بر سر ایماں رفتہ است

یعنی وہ آفتِ جاں چلا گیا، اے ہوش اب آ، تاکہ دیکھوں کہ ایمان پر کیا گذری،

عرفی از ہر دو جہاں می رمد الا در دوست — ہمہ جا وحشی ازان ست کہ رام ست اینجا

بحث در ردّ و قبول بت ترسا بچہ است — ورنہ از کفر نبودی بود ایماں را

یعنی ایمان کفر سے کم رتبہ نہیں لیکن گفتگو یہ ہے کہ کافر بچہ اس کو قبول بھی کریگا یا نہیں،

ز وصلش یافتم ذوقے کہ نبود انتقام آں را — کسے ہرگز چنیں داغے بدل ننہادہ ہجراں را

یعنی اُس کے وصل میں میں نے وہ مزہ پایا کہ اس کا کچھ جواب نہیں ہو سکتا، کسی شخص نے ہجر کو اس طرح نہ جلایا ہوگا جس طرح میں نے جلایا ہے،

قبولِ خاطرِ معشوق شرط دیدار ست — بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی ست

یعنی معشوق جس حد تک پسند کرے اسی حد تک نظارہ کرنا چاہئے، اپنے شوق کے موافق نظارہ بازی کرنا بے ادبی میں داخل ہے،

عرفی! بہ حالِ نزع رسیدی و بہ شدی — شرمت نیامد از دلِ امید وار دوست

بہانہ جوی تو عرفی! بناز عادت کرد — بآشتی مرو اکنوں کہ صلح ہم جنگ ست

ز شکوہ ہائے جفایت، دو کون پر شد لیک — ہنوز رنگِ ادب بر رخِ سخن باقی ست

یعنی باوجود انتہائے شکایت کے پاس ادب نہیں گیا،

حسنش نیازمند تماشا ز ناز نیست — اما ز ذوقِ جلوۂ خود بے نیاز نیست

دو عالم سوختن نیرنگِ عشق ست — شہادت ابتدائے جنگِ عشق ست

دماغ آشفتۂ داریم دل نام — کہ سر تا پائے صلح و جنگ عشق ست

آں چناں مست جمال ست کہ شب تا بسحر
می کشد جام و ز کیفیتِ مے آگہ نیست

بر دلے عقل منہ منطق و حکمت در پیش
کہ مرا نسخۂ غمہاے فلاں در پیش ست

ہاں رہِ عشق ست کج رفتن ندارد بازگشت
جرم را اینجا عقوبت ہست استغفار نیست

تا فریبد ابلہاں را از متاع روی دست
آسماں پیش از تو یوسف را ببازار آورد

ز بت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابروے
بحیرتم کہ دلِ برہمن ز کف چوں شد

چو برد پیام، قاصد کنم ایں خیال دگریم
کہ برش حکایتِ من بکجا رسیدہ باشد

تا چند بزنجیر خرد بند تواں بود
بے مستی و آشوب جنوں چند تواں بود

اے اجل! جان ندہند! اہلِ وفا سعی مکن
یا برو، رخصت از آں غمزۂ خونخوار بیار

اے آنکہ نرفت ست عنانِ دلت از دست
یک لحظہ تماشائیِ آں دست و عناں باش

نشکنم ناقوس و تسبیحے بدست آرم و لے
چوں کنم با آں کہ زنار از میاں می رویدم

میروی با غیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم
لطف فرمودی برو کیں پاے را رفتار نیست

بیا اے عشق! رسوای جہانم کن کہ یک چندے
نصیحت ہاے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

داغ برہم بس کہ پیوستم نشاں از دل نماند
بیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکی ست

عالمے در جلوہ و عاشق نہ بیند غیر دوست
گر نہ مجنوں بر سی اندر کارواں محمل یکی ست

فلسفہ عرفی نے غزل میں جس قدر فلسفیانہ خیالات ادا کئے کسی شاعر نے ادا نہیں کئے، اس کے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ شاعرانہ طرزِ ادا ہاتھ سے نہیں جاتا۔ سنائی ناصر خسرو وغیرہ نے بھی دقیق فلسفیانہ مسائل بیان کئے ہیں، لیکن وہ محض فلسفہ ہے جو نظم میں ادا کر دیا گیا ہے، شاعری نہیں، بخلاف اس کے عرفی اس انداز سے ان باتوں کو ادا کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کی حیثیت سے اُس سے لطف نہ اٹھائے تاہم شاعرانہ

ذوق سے محروم نہ رہے گا، مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا،

یہ سب کہتے آئے ہیں کہ حقائقِ اشیا ہم کو معلوم نہیں، سقراط نے کہا تھا کہ مجھ کو صرف اسی قدر معلوم ہوا کہ کچھ معلوم نہیں ہوا، بعینہ اسی خیال کو فارابی، ابن سینا وغیرہ نے اشعار میں ادا کیا، لیکن عرفی نے اس فلسفہ کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا، وہ کہتا ہے،

حدِ کنہِ تو بہ ادراک نشاید دانست وین سخن نیز باندازۂ ادراکِ من است

خدا کی ذات اور صفات کی جو تفسیر تمام اہلِ مذاہب نے کی ہے خوب غور کیجائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے اُنہی حالات، اُنہی اوصاف، اُنہی اخلاق کو جو اس نے انسانوں میں دیکھے ہیں، زیادہ وسیع، زیادہ پاک، زیادہ بلند فرض کرکے ایک ذات کا تصور باندھ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قوم میں خدا کے اوصاف کی نسبت مختلف خیال ہیں اس بنا پر عرفی کہتا ہے،

فقہاں دفترے رامی پرستند حرم جویاں دری رامی پرستند

بر افگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاران دیگرے رامی پرستند

یعنی خدا اگر اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دے تو لوگوں کو نظر آئے گا کہ ہم خدا کو نہیں بلکہ کسی اور چیز کو پوج رہے تھے، اسی مضمون کو ایک اور لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

آناں کہ وصفِ حسن تو تفسیر می کنند خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

حقائقِ اشیا یا عقائد مذہبی کی نسبت یا تو انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کا فلسفی ہونا چاہئے کہ تمام راز اُس پر منکشف ہو گئے ہوں، یا محض تقلید پر عمل کرنا چاہئے، بیچ کی جو حالت ہے، یعنی نہ تقلید نہ اجتہاد کامل، یہ نہایت خطرہ کی حالت ہے، اور افسوس ہے کہ تمام عالم اسی میں مبتلا ہے، عرفی کو تین سو برس پہلے یہ نکتہ معلوم ہو چکا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

قدم برون منہ از جہل یا فلاطوں شو　　کہ درمیانہ گزینی سراب و تشنہ لبی ست

یعنی یا تو بالکل جاہل رہو یا فلاطون بنو، ورنہ بیچ میں رہو گے تو سراب اور تشنہ لب کا حال ہوگا،

عرفی اپنی وسیع المشربی سے عرفان اور ذوق کو اسلام یا کفر میں محدود نہیں سمجھتا، اسکے نزدیک ہر جگہ حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے، اس خیال کو اوروں نے بھی ادا کیا تھا لیکن عرفی نے ایک عجیب تشبیہ سے اس کو صاف دکھا دیا،

عارف، ہم از اسلام خراب ست و ہم از کفر　　پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

یہ ظاہر ہے کہ پروانہ صرف چراغ ڈھونڈھتا ہے، وہ خواہ حرم میں جلتا ہو یا بتخانہ میں، بت شکنی پر لوگ ناز کرتے ہیں لیکن ایک عارف کو نظر آتا ہے کہ بت شکنوں میں بھی وہی تمام اخلاق موجود ہیں، جو بت پرستوں میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ایسی بت شکنی سے کیا فائدہ، اس بنا پر عرفی کہتا ہے،

رفتم بہ بت شکستن و ہنگامِ باز گشت　　با برہمن گذاشتم از ننگ دین خویش

یعنی بت توڑنے تو گیا تھا لیکن جب واپس چلا تو اپنا دین برہمن اسی کے بہاں چھوڑ آیا،

عام مسلمان جس طرح کعبہ کے ساتھ پیش آتے ہیں اس میں اور بت پرستی میں مشکل سے فرق کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر فیضی نے کہا تھا،

آں کہ می کرد مرا منع پرستیدن بت　　در حرم رفتہ، طواف در و دیوار چہ کرد

عرفی اس مضمون کو زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ساکنِ کعبہ کجا و لتِ دیدار کجا　　ایں قدر ہست کہ در سایۂ دیوارے ہست

عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو سب راز ہی،

ہر کس نشناسندۂ رازست، وگرنہ — ایں ہا ہمہ رازست کہ مفہومِ عوام ست
چو دل شناخت سر رشتہ گشت معلومش — کہ دم بدم بکیف آوردہ و رہا کردست

انسان عالم اکبر ہے

از کتابے کہ نقش خاتمہ ام — لوحِ محفوظ نخستین ورق ست

سالک کو طلب چاہیئے تقاضا نہیں،

زباں بہ بند و نظر باز کن کہ منع کلیم — کنایت از ادب آموزی تقاضا ئیست

یعنی آنکھیں کھولو، اور زبان بند کرو کیونکہ کلیم کو جو منع کیا تھا تو یہ بتانا تھا کہ ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے

حصولِ معرفت کے لئے وہم اور شکوک کی جولانیاں مفید نہیں، بلکہ سکون اور صبر درکار ہے

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم — ساکن شدم میانۂ دریا کنارہ شد

تہ رسی اور غور کی ترغیب

خمیر مایۂ آسایش ست لای شراب — بگو کہ صاف کشاں جرعہ زتہ گیرند

لوگ نیک و بد میں تمیز نہیں کرسکتے،

چہ ظلمت ست کہ بینندگاں نمی دانند — کہ شب چراغ ستانند یا شبہہ گیرند

کسی قوم کی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ دوسری قوم نے تنزل کیا ہے،

زمانہ گلشنِ عیشِ کرا؟ بہ یغما داد — کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ می آید

چونکہ مذہب کا مقصد زیادہ تر جمہور عام کی ہدایت کرنا ہوتا ہے، اس لئے مذہبی دلائل اکثر فلسفیانہ نہیں ہوتے بلکہ خطابیات اور عام فہم ہوتے ہیں، جن لوگوں کی فطرت میں خدا نے مذہبی میلان رکھا ہے ان کو انہی دلائل سے تشفی ہو جاتی ہے لیکن جن کو مذہب کا درد نہیں ان کو فوراً نظر آجاتا ہے کہ یہ دلائل قطعی نہیں، بلکہ عام پسند ہیں، اس بنا پر ان لوگوں

کو ناز ہوتا ہے، کہ ہم کس قدر حقیقت شناس ہیں، عرفی کہتا ہے کہ یہ ناز کی بات نہیں بلکہ مذہبی بیدردی کی دلیل ہے، اس کو یوں ادا کرتا ہے،

زنقصِ تشنہ لبی داں بعقلِ خویش مناز | دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

سراب اس ریتے کو کہتے ہیں جو دور سے پانی کی طرح نظر آتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو تمھارا گذر سراب پر ہوا، اور تم نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ سراب ہے، پانی نہیں، تو تم اپنی عقل پر ناز نہ کرو، بلکہ یہ سمجھو کہ تم پیاسے نہ تھے، ورنہ اگر پیاس کا غلبہ ہوتا تو قطعاً سراب پانی نظر آتا، سراب کی تشبیہ شاعر نے علی سبیل التنزل دی ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ مذہبی دلائل سراب نہیں ہوتے،

عام لوگ سمجھ نہیں سکتے ورنہ عرفا کنایوں میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں،

گو کہ نکتہ سرایانِ عشق خاموش اند | کہ حرفِ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند

کفر اور دین، دونوں اپنی گرم بازاری کے لئے لوگوں کو لڑواتے ہیں،

کفر و دیں را ببر از یاد کہ ایں فتنہ گراں | در بد آموزی ما مصلحت اندیش ہم اند

تعلق، ہر قسم کا حجاب پیدا کرتا ہے،

گر تعلق نیست اسبابِ جہاں مردود باش | صد ہزاراں پردہ پیش پردہ حائل یکیست

اخلاق عرفی نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں، لیکن وہ صرف ان اخلاقی اوصاف کو لیتا ہے، جو عزتِ نفس اور علو حوصلہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں تک کہ اگر یہ اوصاف غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اس کے نزدیک اُن اوصاف سے بہتر ہیں، جن کی سرحد پست ہمتی سے مل جاتی ہے، مثلاً تواضع، انکسار، فروتنی، توکل، قناعت وغیرہ وغیرہ، اسی بنا پر کہتا ہے،

کفرانِ نعمت گلہ مندانِ بے ادب ــــ در کیشِ من زشکرِ گدایانہ بہتر ست

وہ اعمال نیک کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس لئے نہیں کہ دوزخ سے بچنے کا ذریعہ ہیں، بلکہ اس لئے کہ گنہگار نادم ہوتا ہے، اور بسا اوقات ندامت نجات کا باعث ہوجاتی ہے؛ اس لئے وہ مفت خواری کی نجات کو عالی حوصلگی کے خلاف سمجھتا ہے،

بضاعتے بکف آر کہ ترسمت، فردا ــــ بجوئے خشانی پیشانی حیا بخشند

یعنی عمل کا سرمایہ جمع کرد ایسا نہ ہو کہ تم کو قیامت میں اس لئے بخشدیں کہ تمھاری پیشانی سے ندامت کا پسینہ ٹپکا تھا،

اس سے زیادہ صاف اور واضح کہتا ہے،

گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت ــــ قبول کردن و رفتن نہ شرطِ انصاف است

یعنی یہ مان لیا کہ مجھ کو بہشت بغیر عمل کے مل جائے گی لیکن اس کو قبول کرنا انصاف کے خلاف ہے،

وہ عالی حوصلگی کا یہ نمونہ پیش کرتا ہے، کہ مخالف، گو ہماری غلطی کو صحیح سمجھ لے، تاہم ہم کو مطمئن نہیں ہونا چاہئے،

رستم زمدعی بقبولِ غلط و لے ــــ ور تابم از شکنجۂ طبعِ سلیمِ خویش

وہ یہ سکھلاتا ہے کہ گفتگو اور مباحثہ کی معرکہ آرائیوں میں فتح حاصل کرو، لیکن اس طرح کہ فریق مقابل کا دل نہ دکھنے پائے،

زخمہا برداشتیم و فتح ہا کردیم لیک ــــ ہرگز از خونِ کسے رنگین نشد دامانِ ما

وہ تجرد، صحرا نوردی، ترکِ لباس کو ریا کا شائبہ بتاتا ہے،

مرد بیادیہ گردی کہ رزق و شیدائی ست ــــ برہنگی مطلب کان لباسِ رعنائی ست

وہ سکھاتا ہے کہ اپنے آپ کو عزیز الوجود نہ سمجھو، دنیا کا کارخانہ تم پر بند نہیں،

گمان مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

وہ بتاتا ہے کہ اگر اپنا عیب دیکھنا چاہو تو اپنے آپ کو خود اپنا دشمن اور منافق دشمن بنا کر دیکھو

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا یک دم منافقانہ نشین بہ کمینِ خویش

منافق اس کو کہتے ہیں، جس کے دل میں مخالفت ہو اور زبان سے دوستی کا اظہار کرتا ہو، شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اپنے عیب سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اُس کی ترکیب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کرو اور اُس سے بظاہر دوستی کا اظہار کرو، چونکہ انسان اپنے دوست سے کسی بات کا پردہ نہیں رکھتا، اس لئے وہ شخص اپنے تمام راز تمھارے سامنے کھول کر رکھدیگا، اس طرح تمام عیب ظاہر ہو جائیں گے،

وہ کہتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے روحانی اخلاق ایک کافر کے اخلاق سے بالاتر نہیں، تو اُس کے اسلام کو کفر پر کوئی ترجیح نہیں،

رفتم بہ بت شکستن ہنگام باز گشت با برہمن گذاشتم از شرم دینِ خویش

اس نے نہایت عمدہ تشبیہ سے اس بات کو علانیہ دکھایا کہ جو لوگ خود آلودہ ہیں ان کی نصیحت کچھ اثر نہیں کر سکتی،

وعظِ من گرد فتانندۂ عصیاں نشود آستینِ شکر آلود مگس راں نشود

وہ کہتا ہے کہ ریاکاری اس قدر عام ہو گئی ہے کہ کھلے ڈلے رندوں پر بھی اعتماد نہیں رہا،

از صدقِ اہلِ بُت کدہ ہم اعتماد رفت از بس کہ اہل صومعہ تزویر می کنند

زاہد اور برہمن میں اس کے نزدیک جو فرق ہے، یہ ہے،

کافر ترست زاہد از برہمن، ولیکن او را بت ست در سر، در آستیں ندارد

یعنی زاہد برہمن سے بھی زیادہ کافر ہے، فرق یہ ہے کہ زاہد کے ہاتھ میں بت نہیں ہے، بلکہ سر میں ہے،

آزادی اور خود مختاری کا وہ اس قدر شیفتہ ہے کہ اگر کوئی شخص نام کو بھی آزاد ہو تو اس کے نزدیک رشک کے قابل ہے،

حسدِ تہمتِ آزادی سرو دم بگداخت　　کیں مرادے ست کہ بر تہمتِ آں ہم حسدست

سرو کو شعرا آزاد باندھتے ہیں، عرفی کہتا ہے کہ گو یہ تہمت ہے، لیکن میں اس پر بھی رشک کرتا ہوں، کیونکہ آزادی وہ نعمت ہے کہ جھوٹوں بھی کوئی شخص آزاد کہلائے تو رشک کے قابل ہے،

وہ سکھلاتا ہے کہ اصلی لذت اور آرام، روحانی لذت اور آرام ہے، اور یہ حاصل ہو تو ظاہری تکلیفات سے مطلقاً متاثر نہیں ہونا چاہیے،

معشوق در میانۂ جاں مدعی کجاست　　گل از دماغ می دمد آسیب خار چیست

وہ ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دیتا ہے، اور اس مضمون کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

مرا دو خضر عناں گیر باید از چپ و راست　　کہ کج روی نہ کنم ورنہ عزمِ راہِ خطاست

امامِ شہر ز سر جوشِ خم نہ پرہیزد　　نزاع بر سرِ تہ شیشہ ہای ناصاف ست

یعنی مال حرام، اگر بھرپور ملے تو امامِ شہر کو دریغ نہ ہو، یہ جو انکار ہے اس لحاظ سے ہے کہ اُس کی مقدار تھوڑی ہے،

علو نفس، بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کے خیالات، جو عموماً شاعری میں نہایت کم ہیں، عرفی نے کثرت سے ادا کئے، چونکہ خود نہایت غیور اور عالی حوصلہ تھا، اس لئے وہ عادات

اور اخلاق جو بظاہر علو نفس کے خلاف نہ تھے، لیکن دراصل ان کی بنیاد دنارت پر تھی، ان کی تہ تک اس کی نگاہ پہنچتی تھی، مثلاً تمام ایشیا میں حاتم کی فیاضی اور سخاوت کے چرچے پھیلے ہوئے ہیں اور تمام لوگ اسکی فیاضی کے افسانوں کو مزے لے کر بیان کرتے ہیں، یہ امر بظاہر کوئی بری بات نہیں بلکہ سچی قدردانی کی دلیل ہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ایشیا میں اکثر مفت خواری کا طریقہ جاری رہا، یعنی لوگ سلاطین اور امراسے مفت کے صلے اور انعامات حاصل کرتے تھے، اس لئے اس قسم کی فیاضیوں کی نہایت مدح سرائی کرتے تھے، عرفی نے دیکھا کہ اس قدردانی کی تہ میں اس مفت خواری کا اثر ہے، اس لئے کہتا ہی،

بیا بہ ملک قناعت کہ در دسرنہ کشتی ٭ ز قصہ ہا کہ بہمت فروش طے بستند

یعنی اگر قناعت اختیار کرلو تو تم کو ان کہانیوں میں کچھ مزہ نہ آئیگا جو حاتم طائی کی طرف منسوب ہیں،

اس سے زیادہ صاف کہتا ہے،

کفرانِ نعمت گلہ مندانِ بے ادب ٭ در کیشِ من ز شکر گدایانہ بہتر ست

یعنی میں کفرانِ نعمت کو بھی گدایانہ شکر گذاری سے زیادہ پسند کرتا ہوں،

زمانہ کے ہاتھ سے مجبور ہوکر معمولی چیز کی خواہش کرتا ہی پر خود اسکو افسوس آتا ہی اور کہتا ہی،

کشادہ دام بہ گنجشک و شادم یاد آں ہمت ٭ کہ گر سیمرغ می آمد بدام آزاد می کردم

یعنی اب تو میں گنجشک پر جال ڈالتا ہوں اور اسی پر راضی ہوں لیکن ایک وہ بھی وقت تھا کہ سیمرغ جال میں پھنسا ہے، اور میں نے چھوڑ دیا ہے،

بساطے کاندر و طرح دو عالم می تواں کردن ٭ بدست آوردہ ام اندازۂ و بر کار می باید

گر فتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت ٭ قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف ست

وقتِ عرفی خوش کہ نکشودند اگر در بر رخش
بر درِ نکشودہ ساکن شد، درِ دیگر نہ زد

عاشقانہ جذبات اور خیالات میں بھی اس کی عالی حوصلگی نہیں جاتی،

من ازیں دردِ گرانبار چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

یعنی اس غم سے مجھ کو کیا لذت مل سکتی ہے جبکہ اسکی برابر مجھکو صبر اور استقلال بھی عنایت ہوا ہے؛ تذکرۂ سرخوش میں لکھا ہے کہ "ناصر علی اس شعر کو بہت پسند کرتا تھا"، اگر یہ صحیح ہے تو ناصر علی کی اس بدمذاقی کا کفارہ ہوگیا جو اُس نے نظامی اور ظہوری کے موازنہ میں ظاہر کی تھی،

بادہ خواہی باش تا از خونِ دل پرورد ہم
ایں کہ در جام و سبو دارم ہمیا آتش ست

ہم سمندر[1] باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
روی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

عشق اگر مردست مرشے تابِ دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد بسیار آورد

مدہ عنانِ تعلق بجسن ہر ذرہ
برآر دستی و بر دوشِ آفتاب انداز

نہ بزمِ آسمان دیکے ذرہ در سماع
داں ہم بکامِ دل نفشاند آستینِ خویش

یعنی آسمان کی نو مجلسوں میں ایک ذرہ (انسان) وجد کر رہا تھا، لیکن ان مجلسوں کی مجموعی فضا میں بھی یہ وسعت نہ تھی کہ وہ ذرہ ہاتھ پھیلا کر ناچ سکتا،

---

[1] عوام کے اعتقاد میں ایک کیڑا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ ہی میں زندہ رہتا ہے،

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام، نظیری تخلص اور نیشاپور وطن تھا، شاعری کا ابتدا سے شوق تھا اور ابتدائے مشق ہی سے شہرت ہو چلی تھی، خراسان میں جب اس کی شاعری مسلّم ہو چکی تو کاشان میں آیا، یہاں حاتم، فہمی، مقصود خردہ، شجاع، رضائی، شاعری میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے، اُن کے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتی تھیں، نظیری بھی اُن میں طبع آزمائی کرتا تھا، اسی زمانہ میں ایک قدیم غزل طرح ہوئی، جائے تو باشد، ایمائے تو باشد، نظیری نے غزل لکھی،

فلک مزدور ایمائے تو باشد　　نوازد ہر کرا رائے تو باشد

"جائے" کا قافیہ استادوں کی غزل میں اس پہلو سے بندھ چکا تھا کہ اُس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا، مثلاً

دو عالم را بیک بار از دلِ تنگ　　بروں کردیم تا جائے تو باشد

نظیری نے اس پامال قافیہ کو بالکل نئے پہلو سے باندھا[1]،

نیازارم ز خود ہرگز دلے را　　کہ می ترسم در و جائے تو باشد

اسی قافیہ میں ایک اور اُستاد کا شعر یاد آیا،

جہانے مختصر خواہم کہ در وے　　ہمیں جائے من و جائے تو باشد

اس زمانہ میں عبدالرحیم خانخاناں کی فیاضی کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا، نظیری

---

[1] شعرائے مذکور کا مشاعرہ اور غزل کا یہ شعر مآثر رحیمی میں نقل کیا ہے،

نے اس کے دربار کا قصد کیا، اور آگرہ میں خانخاناں سے ملا، چنانچہ جو قصیدہ اس موقع پر لکھا اور جو دیوان میں موجود ہے، اُس کا عنوان یہ لکھا ہے،

"ایں قصیدہ در مدح صاحب حلیم ابو الفتح بہادر عبد الرحیم خانخاناں بن بیرم خاں ہنگامے کہ بایلغار از گجرات بدار السلطنت آگرہ آمدہ بودند و اول مداحی و ملازمت ایں جا کردہ بود گفتہ شدہ"

غالباً یہ ۹۹۲ھ ہجری ہوگا، کیونکہ اسی سنہ میں خانخاناں گجرات سے آگرہ گیا ہے، اور مظفر گجراتی کے شکست دینے کے صلہ میں، اس کو خانخاناں کا خطاب ملا ہے،

غالباً خانخاناں ہی کی تقریب کرنے سے اکبر کے دربار تک رسائی ہوئی اول اول جب وہ دربار میں پہنچا ہے تو جہانگیر کے بیٹا پیدا ہونے کا جشن تھا، نظیری نے جو قصیدہ اس موقع پر پیش کیا ہے، اس کے عنوان میں صرف اسی قدر لکھا ہے، نام کی تصریح نہیں کی، قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خسرو کی ولادت کا جشن ہوگا جو ۹۹۶ھ ہجری میں پیدا ہوا تھا، اس قصیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نظیری کے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے تھے جو اسکی رسائی میں خلل انداز ہوتے تھے، چنانچہ خاتمہ میں کہتا ہے،

جماعتے ز سفیہانِ تیرہ طبعِ دنی ۔۔۔ مدام در پیش افتادہ اند ہجو و بال

ز بے تمیزیٔ ایں ناقدانِ کم مایہ ۔۔۔ گہر بقدر خزف گشتہ ز سرخ سفال

سزد کہ اختر نظم مرا بیک ساعت ۔۔۔ توجہ تو برد ل آرد از ہبوط و بال

اکبر کی مدح میں اس نے وقتاً فوقتاً اور بھی قصیدے لکھے، اور غالباً مقبول بھی ہوئے لیکن دربار میں اسکو کوئی خاص امتیاز نہیں حاصل ہوا، اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق خانخاناں کے دربار سے قائم رکھا، اور احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی، چند برس کے بعد حج کا

ارادہ کیا اور اس تقریب میں ایک قصیدہ لکھ کر خانخاناں کی خدمت میں پیش کیا جس کا مطلع یہ ہے

زہنر خود نگنجم چو بہ خم مے مغانی بدر و لباس بر تن چو بچہ شدم معانی

اس میں شاعرانہ طریقہ سے مصارفِ سفر کی درخواست کی،

ہمہ عیش ایں جہانی بعنایتِ تو دیدم چہ عجب اگر بیابم زتو زاد آنجہانی

خانخاناں نے سفر کا سامان کر دیا، چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ[۱] کو روانہ ہوا، راستہ میں بدوؤں نے لوٹ لیا، تاہم اس نے حج و زیارت دونوں حاصل کی،

مآثر رحیمی میں نظیری کا سفر ۱۰۱۲ھ ہجری میں لکھا ہے لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے، نظیری کے دیوان میں ایک قصیدہ سلطان مراد (ابن اکبر شاہ) کی مدح میں ہے، اس کے عنوان میں خود نظیری لکھتا ہے،

"ایں قصیدہ نیز بعد از معاودت مکہ معظمہ بہ احمد آباد گجرات در مدح شاہزادۂ ہمایوں نژاد شاہ مراد گفتہ شدہ"

یہ مسلّم ہے کہ مراد ۱۰۰۸ھ ہجری میں مرا ہے، اس لئے نظیری کا سفر حج ۱۰۱۲ھ ہجری میں محال ہے، زیادہ تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مآثر رحیمی کا مصنف نظیری کا ہمعصر اور اسکا خواجہ تاش ہے، قیاس یہ ہے کہ نظیری نے ۱۰۰۲ھ ہجری میں حج کیا ہے، علاوہ اور قرائن کے ایک قرینہ یہ ہے کہ خان اعظم مرزا کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) نے اسی سال میں حج سفر کیا تھا اور نظیری کے دیوان میں ایک قصیدہ خان اعظم کی مدح میں ہے، جس کا عنوان یہ ہے،

ایں قصیدہ در راہ مکہ مکرمہ بعد از غارتِ سارقان و حرامیانِ بذیل بمدح نواب محمد عزیز اعظم خاں منظوم شدہ"

---

[۱] مآثر رحیمی۔

اس قصیدہ میں اپنی حالت بیان کرکے درخواست کی ہے کہ میرے زادِ راہ کا سامان کر دیا جائے،

به گوشهٔ نظر التفات، محتاجم | بزاری که توان کشتنم به نیم نگاه
زبے بضاعتی خود چناں ہراسانم | که بهر توشهٔ ره باز گردم از ارکاه
بسیلِ مرحمت از خاکِ ذلتم بردار | که ہمچو علبهٔ عطشاں فتاده ام بره راه

حج سے واپس آکر اس نے مراد کے دربار میں رسائی حاصل کی، اکبر نے شاہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا، وہ ان اطراف میں فوجیں لئے ہوئے پڑا تھا، نظیری چلتا پھرتا اس طرف جا نکلا دربار میں جانا چاہتا تھا کہ راہ میں ایک قدردان سخن کی نظر پڑ گئی اس نے بڑھ کر کہا کہ خوب موقع پر آئے، نوروز کا جشن ہے، قصیدہ لکھ کر پیش کیجئے، خود جا کر شاہزادہ سے تقریب کی، چوبدار آکر لوا گیا، دربار میں سجدہ بجا لانے کا دستور تھا، لیکن دربار کی شان و شوکت دیکھکر نظیری کے حواس جاتے رہے، اس لئے آداب اور آئین سب بھول گیا، نقیبوں نے باز پرس کی تو جواب دیا کہ میں نے آج تک یہ شان و شوکت نہیں دیکھی تھی اسلئے حواس ٹھکانے نہ رہے، یہ تمام واقعات نظیری نے خود قصیدۂ مدحیہ میں لکھے ہیں موقع کے خاص خاص اشعار ہم نقل کرتے ہیں،

دراں بساط که بر خودم اشعور نبود | ز دور دیدهٔ دانا و لے بمن افتاد
بمن گفت که ای زیب بخش مجمع انس | بیا بیا که بوقت آمدی مبارکباد
بساط مجلس و آئین جشن فرودی ست | تو نیز جلوهٔ آئین نظم خواہی داد
ہمیں دو دیده و یکقت ہنوز پیدا بود | که شد عزیو کزیں قطره کرد دریا یاد
چناں بپایهٔ دولت شدم شتاب زده | که چند بار سرم در مقام پا افتاد
زبس که تیز آں بارگاه در رفتم | ادب ز پایهٔ خود پائی بر فراز نهاد

زدلفریبی آئین و فرّ سلطانی | بگاہ تہنیتم، رسم سجدہ رفت از یاد
چو خوب رسم ادب را بجا نیاوردم | ندا رسید کہ اے روستائے مادرزاد
بساط عرش و تکبر، ترا چہ پیش آمد | حریم کعبہ و غفلت، ترا چہ حال افتاد
جواب دادم و گفتم بجرم معذورم | کہ تا منم بچنیں دولتے نگشتم شاد

سنہ ۱۰۱۴ہجری میں اکبر نے وفات پائی اور جہانگیر تخت پر بیٹھا، وہ نہایت سخن شناس اور صاحب ذوق تھا، نظیری کا شہرہ سن کر دربار میں طلب کیا، چنانچہ ۵ سنہ تخت نشینی مطابق سنہ ۱۰۱۹ھ میں نظیری دربار میں حاضر ہوا اور انوری کے قصیدے پر قصیدہ لکھکر پیش کیا، جہانگیر خود تزک میں اس واقعہ کو لکھتا ہے:

"نظیری نیشاپوری کہ در فن شعر و شاعری زمرۂ قرار دادہ بود و در گجرات بعنوان تجارت بسر می برد قبل ازیں طلبیدہ بودم دریں ولا آمدہ ملازمت کرد قصیدۂ انوری کہ

ع بازایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را

تتبع نمودہ قصیدہ بجہت من گفتہ بود گذرانید ہزار روپیہ و اسپ خلعت بصلہ ایں قصیدہ بدوم حمت نمودم۔"

نظیری نے قصیدہ میں دربار کی رسائی کی پوری تفصیل لکھی ہی،

ناگاہ در آمد ز درم بانگ کہ گویند | فرمانِ طلب آمدہ از شاہ فلاں را
بے کفش و عمامہ بدر از خانہ دویدم | نے کردہ قبا در بر و نی بستہ میاں را
تا حاکم دیوان و بلد بر در سولم | دیدم ہمہ جا خردہ دہانِ مژدہ رساں را
اصحاب چساں مصحف از اصحاب ستانند | بگرفتم از احباب بہ تعظیم نشاں را

یعنی جس طرح لوگ قرآن شریف تعظیم سے لیتے ہیں اسی طرح میں نے بادشاہ کا خط تعظیم سے ہاتھوں میں لیا،

بوسیدم و بر فرق بہ تسلیم نہادم	بکشادم و بر ناصیہ سودم رخ آں را
می دیدم و می سودم ازاں سرمہ نظر را	برخواندم و لیسیدم ازاں شہد زباں را
فی الحال و دیدم ز پے مرکب ساماں	کردم زہمہ وی وداع اہل مکاں را
امروز سہ ماہ است کہ پویان سراغم	گلشن بہ دماغ و بہ بغل حاصل کاں را
چوں بجر تو در جزر و مد شیر شکاری	چوں گنج روان من بطلب گنج رواں را

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے فرمان طلبی کے بعد تین مہینے نظیری کو دوڑ دھوپ میں گذرے، جس کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر شکار میں مصروف تھا،

یہ وہ زمانہ ہے جب نظیری تارک الدنیا ہو چکا تھا، لیکن غلامی اور طماعی کی جو عادت راسخ ہو چکی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ تین مہینے تک خاک چھانتا پھرا، اور شاہی فرمان کو قرآن شریف سے تشبیہ دی،

جہانگیر نے ایک دفعہ اس سے ایک عمارت کے کتابہ کی فرمایش کی، اُس نے یہ غزل لکھ کر پیش کی،

اے خاک درت صندل سر گشتہ سراں را	باد امرہ، جاروب رہت، تاجوراں را

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگہ زمین انعام میں دی[1]،

گلزار ابرار[2] میں لکھا ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کرکے گوشۂ عزلت اختیار کیا، نظیری ۱۰۲۱ سنہ ہجری میں مرا ہے، اس لئے ۱۰۰۹ سنہ ہجری میں وہ گوشہ نشین ہوا ہوگا، دو تین قصیدوں کے شان نزول میں اس نے خود بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن امرا کی مداحی اس حالت میں بھی جاری تھی، چنانچہ یہ قصیدہ بھی اسی زمانہ کا ہے،

[1] سرو آزاد، ید بیضا [2] نسخہ موجودہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی،

چندے بہ غلط بتکدہ کردیم حرم را   وقت ست کہ از کعبہ برآریم صنم را

اخیر میں اس کو علوم دینیہ کی تحصیل کا شوق ہوا، سنہ ۱۰۰۴ ہجری میں جب وہ خانخاناں کی ہمرکابی میں دکن گیا ہے، تو راہ میں منڈو سے گذرا، یہاں شیخ غوثی منڈوی سے ملاقات ہوئی، انیسی، شریف کاشی، کافی سبزواری، ملا بقائی وغیرہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے، نظیری کو جب دینیات کا شوق ہوا تو انہی شیخ غوثی سے پہلے عربیت کی تحصیل کی، پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی[1]،

سنہ ۱۰۲۰ ہجری میں گجرات سے آگرہ میں آیا اور خانخاناں کو اپنا دیوان حوالہ کرکے پھر گجرات واپس آیا[2]،

سنہ ۱۰۲۳ ہجری میں بہ مقام احمد آباد گجرات وفات پائی، مکان کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی اسی میں دفن ہوا، یہ مآثر رحیمی کی روایت ہے، ورنہ تمام تذکروں میں سالِ وفات سنہ ۱۰۲۰ ہجری یا سنہ ۱۰۲۱ ہجری لکھا ہے،

نظیری کی قبر جس محلہ میں ہے، اس کا نام تاجپورہ ہے، قبر پر ایک گنبد بھی ہے،

عام حالات اور اخلاق وعادات نظیری نے اگرچہ بہت سے درباروں کی آستان بوسی کی لیکن اسکا اصلی تعلق خانخاناں کے دربار سے تھا، خانخاناں کو خان اعظم کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) کی بہن بیاہی تھی، اس تعلق سے خان اعظم کی مداحی بھی کی ہے، اور باقی اکبر اور جہانگیر اور مراد تو حکمرانِ وقت تھے، ان کی مداحی نہ کرتا تو کیا کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ مراد سے اس کو دلی محبت تھی، شہزادہ موصوف کا جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں دلی جذبات نظر آتے ہیں، **شہزادہ مراد سے محبت**

اے بزم تیرہ، اُرخِ چوں ارغواں کجاست   دے رزم! درہمی، شہ گیتی ستاں کجاست

---

[1] گلزار ابرار و خزانہ عامرہ تذکرہ شکیبی [2] مآثر رحیمی،

شوقِ سجود و حرمتِ تعظیم کمتر ست | آں ناز صدر و سرکشیِ آستاں کجا ست
برگ و شگوفہ ریخت ثمر از کجا خورم | بشکست شاخ برگ مرا آشیاں کجا ست
کس را سر و د در خورِ ایں تعزیت نبود | پیدا کنید کا دلِ ایں داستاں کجا ست
خلقے بہ شیون اند، ونگویند حال چیست | صبر سخن شنیدن و تاب بیاں کجا ست

آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعثِ الم مرد و زن شدہ

غم خاست، در پیالہ می از ساغر افگنید | شد بزم تیرہ، پردہ ازاں رخ بر افگنید
شمعے کہ دہر روشن از و بود مردہ است | پروانہ را بر و بخاکستر افگنید
در بزم او ز حلقۂ ماتم، خرام نیست | ایں حلقہ را از صحن سرا بر در افگنید
ریحانِ جلوہ، یاسمن عشوہ، ریختہ | چینید و ہم براں قدِ جاں پرور افگنید
رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود | بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید

خیزید تا بہ آں سرِ تابوت دم زنیم
عرضی کنیم و کار و داعش بہم زنیم

خانخاناں کے دربار میں جس قدر شعرا تھے، یعنی عرفی، شکیبی، انیسی وغیرہ سب سے معرکے رہتے تھے، ایک مرتبہ خانخاناں نے انیسی کو ایک خط لکھا، جس کے حاشیہ پر نظیری کو بھی سلام لکھا تھا، نظیری کو نہایت ناگوار ہوا، ایک قصیدہ لکھا جس میں شکایت کا اس طرح اظہار کیا[1]،

تدے دو سہ مخصوص دلِ ما نکشیدے | مخدوم چنیں یاد نہ کرد ست خدم را

---

[1] مآثر رحیمی،

ما نام خود از حاشیہ شستیم کزیں بیش — مہمان طفیلی نتواں بود قلم را

لاکھ روپیہ کا انعام ایک دفعہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپیے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہوگا؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا، خانخاناں نے لاکھ روپیے منگوا کر سامنے رکھوا دیئے نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپیے تو دیکھ لیے، خانخاناں نے روپیے اس کے گھر بھجوا دیے،

تجارت وصنعت نظیری کو زرگری میں کمال تھا، اس کے ساتھ تجارت بھی کرتا تھا شاعری کی فتوحات الگ تھی، اس بنا پر امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور اُمرا میں اس کا شمار ہوتا تھا،[1] لیکن مزاج میں عرفی کی آن بان نہ تھی، اسلئے مرتے مرتے بھی مداحی کا شغل نہ چھوٹا،

مذہبی تعلیم بخلاف اور شعرا کے مذہب میں سخت تھا، اکبر کے دربار میں جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے تھے، اُن سے بہت جلتا تھا، شاہزادہ مراد کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں اس کا خاص ذکر کیا ہے، اور ابوالفضل یا مبارک کا نام بھی کنایۃً لیا ہے،

طبیعتِ ہمہ ابنائے دہر ملحد شد — وے زفطنتِ تو بر طرف فتادالحاد

اگرچہ فضلہ از فاضلانِ حاملِ دہر — بہ طمع جاہ وغنا کرد، مذہبے ایجاد

پس از حصولِ مرادات حالِ آں فاسد — مثل چو باغِ ارم گشت وحسرت شداد

سفر حج جس ذوق وشوق سے کیا ہے، اس سے بھی اس کے مذہبی جوش کا اندازہ ہوتا ہے، جہانگیر اور شاہ عباس صفوی دونوں نے تنباکو کے استعمال کو منع کرا دیا تھا[2] لیکن ع

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

لوگ باز نہیں آتے تھے، نظیری بھی اس کا جان دادہ تھا، چنانچہ تنباکو کی تعریف میں

---

[1] مآثر الامرا، تذکرۂ خانخاناں وخزانہ عامرہ [2] مآثر رحیمی،

ایک غزل لکھی جو دیوان میں موجود ہے،

تمباکو کی تعریف

نے سنبلِ تنباکوئے نہ آتشِ رخسارۂ — دل بوئے خامے می دہد بے داغ آتش پارۂ
در نخل تنباکو نگر صوفی شدہ باز آمدہ — در کوئے خود سرگشتۂ در شہرِ خود آوارۂ
چوں بید مجنوں ہر طرف افگندہ از سر طرّۂ — چوں دلقِ سالک ہر کجا افگندہ از بر پارۂ

پوری غزل تنباکو کی تعریف میں ہی،

اس زمانہ میں نظیر نام ایک شاعر تھا، نظیری نے اس کو لکھا کہ اپنا تخلص بدل دو تاکہ دونوں تخلصوں میں اشتباہ نہ ہو، چونکہ نظیری دراصل نظیر سے ماخوذ ہے، صرف ایک حرف زائد ہے اس لئے سرقہ کا الزام نظیری ہی پر عائد ہو سکتا تھا، نظیری نے دس ہزار روپے دیکر یہ حرف زائد (ی) خریدا، اور نظیر نے اپنا تخلص بدل دیا[1]،

شعرا میں سے خاص جن لوگوں سے نظیری کے معرکے رہتے تھے، عرفی، ظہوری اور ملک قمی تھے، عرفی نے تو نظیری کو قابلِ خطاب نہیں سمجھا لیکن نظیری نے اس کے مرنے پیچھے، قصیدہ میں اس کو گالیاں سنائیں، چنانچہ عرفی کے حال میں ہم نے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں، ظہوری اور قمی نے سنہ ۱۰۲۰ھ ہجری میں نظیری کے پاس اپنے دیوان بھیجے، اور نظیری نے ایک ایک غزل کا جواب لکھا یہ اوحدی کا بیان ہے (ماخوذ از عرفات) لیکن اس میں کسی قدر مبالغہ معلوم ہوتا ہے، نظیری اس زمانہ کے دو ہی ایک سال کے بعد مرا ہے اس لئے اتنے کم زمانہ میں ظہوری اور قمی کی ہزاروں غزلوں کا جواب کیونکر لکھ سکتا تھا،

نظیری کی خصوصیات ۱- تمدن جب ترقی کرتا ہے تو ہر چیز میں نئے نئے تکلفات پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے لئے جدت پسند صناع نئے نئے سامان پیدا کرتے ہیں، یہ اثر جس طرح

[1] سرو آزاد اور مید بیضا،

مادی چیزوں پر عمل کرتا ہے، غیر مادی اشیا (یعنی خیالات) جذبات، محبت، راز و نیاز، سوز و گداز سب چیزوں پر عمل کرتا ہے، عہد ابتدائے تمدن میں معشوق کے صرف رنگ و روپ اور تناسب اعضا کا خیال آیا، اور اس کے لئے حسن ایک عام لفظ ایجاد کیا گیا، لیکن جب رنگین طبعی اور نکتہ سنجی زیادہ بڑھی تو معشوق کی ایک ایک ادا الگ الگ نظر آئی، اور وسعت زبان نے ان کے مقابلہ میں نئے نئے الفاظ مثلاً کرشمہ، غمزہ، ناز، ادا وغیرہ وغیرہ تراشے، اس قسم کے الفاظ اور ترکیبیں جدت پسند طبیعتیں ایجاد کرتی ہیں، اور یہی طبیعتیں ہیں جن کو اس شریعت کا پیغمبر کہنا چاہیئے، ان الفاظ کی بدولت آیندہ نسلوں کو سیکڑوں، ہزاروں خیالات اور جذبات کے ادا کرنے کا سامان ہاتھ آجاتا ہے، نظیری اس شریعت کا اولوالعزم پیغمبر ہے، اس نے سیکڑوں نئے الفاظ اور سیکڑوں نئی ترکیبیں ایجاد کیں، یہ الفاظ پہلے سے موجود تھے، لیکن جس موقع پر اس نے کام لیا، یا جس انداز سے ان کو برتا، شاید پہلے اس طرح برتے نہیں گئے تھے، مثلاً

از کف لمی دہد دلِ آساں ربودہ را | دیدیم زور بازوی ناآموزدہ را

آساں ربودہ کی ترکیب نئی ہے اور اس سے ایک وسیع خیال ادا ہو گیا، دوسرے مصرع میں زور، بازو، ناآموزدہ، سب مستعمل الفاظ ہیں، لیکن ان سے نئی طرح سے کام لیا ہے، کہنا یہ تھا کہ معشوق کم سن ہے اور اس کو کسی طرح کا تجربہ نہیں تاہم جس شخص کا دل ایک دفعہ اُس پر آجاتا ہے پھر اس کے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتا، اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ ایک ناآزمودہ بازو میں کس قدر زور ہے،

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ سازمش | می آرم اعتراف، گناہ نہ بودہ را

چہ خوش ست از دو یک دل سرحرف باز کردن | سخنِ گذشتہ گفتن گلۂ دراز کردن

اثرِ عتاب بروں، ز دلِ ہم اندک اندک   بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی لطف کا کیا موقع ہوتا ہے، جب دو یک دل دوست آپس میں مل بیٹھتے ہیں، گفتگو چھیڑتے ہیں، پرانے تذکرے کرتے ہیں، شکایتیں شروع ہوتی ہیں، ایک دوست روٹھا ہوا ہے، دوسرا اس کو اس طرح آہستہ آہستہ مناتا جاتا ہے کہ جب وہ کوئی شکایت پیش کرتا ہے تو یہ جھٹ کوئی تاویل گڑھ لیتا ہے، فوری تاویل کرنے کے لئے "بدیہہ آفریدن" کس قدر موزوں لفظ ہے جو ایک بڑے خیال کو کس قدر مختصر لفظ میں ادا کر دیتا ہے ز دلِ ہم، اور اندک اندک کی ترکیب کس قدر واقعہ کی تصویر کھینچ دیتی ہے،

نیست لذت ز نظر بازی بزمے کہ دراں   خندۂ زیرِ لب و گریۂ پنہانے نیست

یہ اُس حالت کی تصویر ہے کہ معشوق، زیبِ مجلس ہے، ہر طرح کے لوگ جمع ہیں، انہی میں عاشق غمزدہ بھی ہے، وہ لوگوں کی آنکھ بچا کر روتا ہے معشوق دیکھ رہا ہے اور مسکراتا ہے اس خیال کے ادا کرنے کے لئے، خندۂ زیرِ لب اور گریۂ پنہاں کس قدر موزوں ہیں،

چناں وقتِ شکایت از نگاہش مضطرب گشتم   کہ مضمونِ سخن صد بار از دل تا زباں گم شد

کہنا یہ تھا کہ میں معشوق سے شکایت کر رہا تھا، دفعتہً اُس نے میری طرف نگاہ غضب سے دیکھا جس کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا کہ سو سو دفعہ دل سے بات نکلتی تھی لیکن ہونٹوں تک آ کے رہ جاتی تھی،

شرم از میاں برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ   گفتارِ بے پرسش ببیں، رفتارِ بے باکش نگر

شمارے تا سحر دستم بزلف در ہمی دارد   گریبانم گریبان ست و دامن دامن ست امشب

شمار داشتن، یعنی مصروف بودن۔ مطلب یہ ہے کہ آج میرا ہاتھ زلفِ پریشان میں مصروف رہا (یعنی میں اسکو سلجھایا کیا) اور میں اپنے گریبان اور دامن کو نہ پھاڑ سکا، اس لئے آج میرا گریبان

گریبان ہے، اور دامن دامن ہے، یعنی دونوں اصلی حالت پر ہیں، گریبان اور دامن کے سلامت رہ جانے کو صرف ان دو لفظوں کے مکرر لانے سے ادا کر دیا ہے، اور یہ کس قدر خوش نما طرز ادا ہے،

۲- وہ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں، اور اس سے عجیب خاص لطف پیدا ہوتا ہے، مثلاً یہ امر کہ معشوق کا ایک ایک عضو یا ایک ایک ادا دل ربا ہوتی ہے، یعنی ہر عضو اور ہر ادا کی طرف دل کھنچتا ہے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

زپائے تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس شعر سے یہ تصویر پیش نظر ہوتی ہے کہ معشوق کا سراپا ایک مجلس ہے، جس میں بہت سے تماشائی جمع ہیں، انہی میں دل بھی ہے، کرشمہ معشوق کے پیش خدمتوں میں ہے، دل اس مجلس میں جب آجاتا ہے تو جدھر اس کا گذر ہوتا ہے، کرشمہ دامن پکڑ کر کھینچتا ہے کہ یہیں بیٹھ جاؤ،

دو نیم گشتہ دل از کفر و دیں نمی دانم　　کزیں دو پارہ دل آید ترا بکار کدام

مقصد یہ تھا کہ دل میں کفر اور ایمان دونوں قسم کے خیالات جمع ہیں یا دونوں طرف اس کا میلان ہے، معلوم نہیں تجھ کو کیا پسند ہے، اس خیال کو اس صورت میں پیش نظر کرتا ہے کہ کفر اور اسلام نے دل کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں، معلوم نہیں کہ ان دونوں ٹکڑوں میں تیرے کام کا کون ہے،

کو زخمِ عاشقانہ کہ در جلوہ گاہِ حسن　　صد چاک دل بہ تار نگاہے رفو کنند

دل شکستہ دراں کوے می کنند درست　　چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

کہنا یہ تھا کہ معشوق کی گلی میں جانے سے رنج و غم اس طرح دور ہو جاتے ہیں گویا کبھی

تھے ہی نہیں، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے کہ دل گویا ایک شیشہ ہے، معشوق کی گلی میں شیشہ سازی کا کارخانہ ہے، وہاں یہ شیشہ اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں سے ٹوٹا تھا،

دیدنش بر دیدنِ من حسرت دیگر فزود | خواستم پیکاں بر آرم از جگر نشتر شکست

می روم جائے کہ غم آنجا ز دلہا می رود | نالہ از ہر جا کہ بر می خیزد آنجا می رود

دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ ہیں | بگرفتہ در انداختن، بازوے چالاکش نگر

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کسی اور معشوق پہ عاشق ہو گیا لیکن معشوقی کی ادائیں اب بھی قائم ہیں، اس لئے عین اس وقت جب کہ اس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا، اس نے معشوق کو اپنا عاشق بنا لیا، اس مطلب کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ گویا دو پہلوان لڑ رہے ہیں، ایک پہلوان نے گرتے گرتے داؤں کر کے حریف کو پچھاڑ لیا،

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود | امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

اور اکِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود | لختے ز حالِ خویش بسیما نوشتہ ایم

من در پیِ رہائی و او از پے فریب | بر سر گرہ زند گرہ ناکشودہ را

کہنا یہ تھا کہ عشق چھوڑنا چاہتا ہوں، لیکن معشوق لطف و مہربانی کی ایسی لگاوٹیں کرتا جاتا ہے کہ اور عشق بڑھتا جاتا ہے، اس مضمون کو یوں مجسم کر کے دکھاتا ہے کہ ایک دھاگے میں گرہ پڑ گئی ہے، ایک شخص اس کو کھولنا چاہتا ہے، لیکن حریف ایسا تیز دست ہے کہ ابھی ایک گرہ کھلنے نہیں پاتی کہ اور دوسری گرہ لگا دیتا ہے،

دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف | نامِ خوباں ہمہ ثبت ست ہمیں نامِ تو نیست

زبیدادِ تو حرفِ مہر را نام و نشاں گم شد | کتابِ حسن را جزوِ محبت از میاں گم شد

نہ چناں گرفتہ جا بمیانِ جانِ شیریں | کہ تواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن

یعنی معشوق اور جان دو چیزیں ہیں جو اس طرح رل مل گئے ہیں کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ جان کہاں ہے اور معشوق کہاں،

بہر نرخے کہ می گیرند کالائے وفا خوب ست　　پس از عمرے گذر افتاد بر ما کاروانے را

۳- اسی خصوصیت کے سلسلہ میں یہ بھی داخل ہے کہ نظیری اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے، اور اس لئے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے، کیونکہ جب دو مخالفت چیزوں میں تناسب اور تشابہ نظر آتا ہے، تو طبیعت میں استعجاب پیدا ہوتا ہے، اس قسم کے اشعار نظیری کے ہاں کثرت سے ہیں، مثلاً

شکوہ نقصان داشت فصلے از میان انداختم　　نرخ ارزاں بود، کالا در دکان انداختم

یعنی میں معشوق کی شکایت کرتا تھا تو وہ ناراض ہوتا تھا، اس لئے میں نے تقریر کا یہ حصہ حذف کر دیا، اس کو یوں تشبیہ دی، کہ چونکہ دام اچھے نہیں اٹھتے تھے، اس لیے میں نے سودا اٹھا کر دکان میں ڈال دیا،

بس غنچہ نشگفتہ بتاراجِ خزاں رفت　　رسم ست کہ رہزن زند از قافلہ پس را

حسن چندے سر بدل شوخی و رعنائی دہد　　شہ چو گیرد مملکت اول بہ یغمائی دہد

یعنی حسن ابتدا میں شوخی اور رعنائی سے زیادہ کام لیتا ہے، کیونکہ بادشاہ جب کوئی ملک فتح کرتا ہے تو پہلے لوٹنے والوں کے حوالہ کرتا ہے کہ لوٹ لیں، حسن بادشاہ ہے اور شوخی و رعنائی فوج کے ساتھ کے لٹیرے ہیں،

ز اظہار محبت بر زبانِ خلق افتادم　　چو محتاجے کہ گنجے یابد و ظاہر کند زودش

بوصلش تا رسم صد بار در خاک افگند شوقم　　کہ نو پردازم و شاخے بلندے آشیاں دارم

آں دہد در گر یہ پند ما کہ با ما دشمن ست　　ہر کہ می گیرد ثنا و را بدر یا دشمن ست

پس از وارستگیہا، بیشتر گشتم گرفتارش　　　چو صیدے جست صیادش از اول سخت تر گیرد

یعنی ایک مرتبہ دل معشوق سے چھڑا کر پھر جو گرفتار ہوا تو سخت گرفتار ہوا، قاعدہ ہے کہ شکاری کے ہاتھ سے جب کوئی شکار چھوٹ جاتا ہے اور پھر ہاتھ آتا ہے، تو شکاری اسکو خوب مضبوط پکڑتا ہے، کہ پھر چھوٹنے نہ پائے،

از شوقِ شہیدانِ حریم سر کویش　　　چوں دانہ در آغوش نگنجد زمیں را

ہمہ شب بر لب و رخسار و گیسو می زنم بوسہ　　　گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

یعنی میں لب، رخسار، اور بالوں کو چومتا ہوں، گویا نسرین اور سنبل کے خرمن میں صبا گھس گئی ہے،

محبت در دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد　　　چراغ را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

یعنی جو دل ایک مرتبہ عشق میں گرفتار ہو چکا ہی، بہت جلد عشق سے متاثر ہو جاتا ہی جس طرح وہ بجھا ہوا چراغ جس سے ابھی دھواں نکل رہا ہے، جلانے سے بہت جلد جل اٹھتا ہے

ز جہر بوالہوس گر دولت عاشق نمی گردد　　　طفیلی جمع شد چنداں کہ جائے میہماں گم شد

یعنی ہوس پرستوں سے معشوق کو اس قدر انس ہی کہ عاشقوں کو نہیں پوچھتا طفیلی اتنے جمع ہو گئے ہیں کہ مہمان کی جگہ نہیں رہی،

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست　　　ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجا ست

یعنی گو سب کچھ ہوا گر دل صاف نہیں تو کچھ نہیں، گویا ایک کتاب میں بہت سے ورق تھے، لیکن جس ورق پر سیاہی گر گئی ہے اصلی مطلب وہیں تھا،

تا کے چو موج آب بہر سو شتافتن　　　در عین بحر پائے چو گرداب بند کن

بر نمی آید ہلال عیدم از ابر امید　　　عمر رفت و ہمچو طفلاں بر در و بامم ہنوز

دلم از نالہ خوش گردید، امید اثر باشد　　بے آسود شستم[1] ایں خدنگم کارگر باشد

شکاریوں کا خیال ہے کہ جب تیر نشانہ پر لگتا ہے تو چٹکی کو آرام معلوم ہوتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اب کی جو نالہ کیا اُس سے میری طبیعت بہت محظوظ ہوئی، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نالہ میں اثر ہوگا، جس طرح چٹکی کو جب لطف محسوس ہوتا ہے تو ضرور وہ تیر نشانہ پر لگتا ہے،

چو خانۂ سرکشت ست عہد را بنیاد　　ز ہر طرف کہ نسیمے وزید رو زن شد

کھیت کی حفاظت کے لئے جو چھپر وغیرہ بنا لیتے ہیں، اس کو خانہ کشت کہتے ہیں، کہتا ہے کہ معشوق کے وعدے ایسے ہیں، جیسے خانہ کشت کہ جدھر سے ہوا کا ذرا جھونکا آیا سوراخ ہو گیا،

خدنگِ جبہۂ توفیق امشب در کمانم بود　　غزالم در نظر بسیار خوب آمد خطا کردم

کہنا یہ تھا کہ آج میں معشوق کے ظلم سے تنگ آکر اس کے حق میں بددعا کرنی چاہتا تھا لیکن اس کے حسن کا خیال آیا، اور رُک گیا، اس کو یوں ادا کرتا ہے کہ ہرن سامنے آیا میں تیر چلہ میں جوڑ چکا تھا لیکن ہرن کی ادائیں اس قدر آنکھوں میں کھب گئیں کہ میں نے دانستہ چھوڑ دیا،

۴- وہ اکثر عشق اور عاشقی کی سچی اور صحیح واردائیں بیان کرتا ہے، اس لئے دل پر ان کا خاص اثر ہوتا ہے

خواہی کہ متوہش شود عشقِ نظیری　　گاہ از نظر خویش براں گاہ نگہ دار

معشوق سے کہتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ نظیری کا عشق اور بڑھے، تو کبھی اُسکو اپنی نظر سے گرا دو، اور کبھی محبت کی نظر سے دیکھ لو،

---

[1] یعنی میری چٹکی کو بہت آرام اور لطف محسوس ہوا،

قاصد جگرم سوخت چہ پیغام وچہ نامہ　　دل بود ہماں خوش کہ باُمید خبر بود

باوجود ناامیدی بس کہ مشتاق توام　　مدعی گر مژدۂ وصلم دہد باور کنم

کس قدر عجیب لیکن سچی بات ہے، انسان جب کسی بات کا نہایت مشتاق ہوتا ہے تو اُس کے ہونے کی خبر اگر دشمن بھی آکر بیان کرے تو انسان شوق کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے، اس بنار پر کہتا ہے کہ معشوق کے وصل کی خوشخبری خود رقیب بھی آکر دے تو مجھکو یقین آجائے

بمہربانی او اعتماد نتواں کرد　　کہ تازہ عاشقم و خاطرش بمن صاف است

این دل کہ در وصال تسلی از و نبود　　خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

یعنی ایک وہ وقت تھا کہ وصل حاصل تھا، لیکن تسلی نہیں ہوتی تھی، اور اس سے بھی زیادہ کسی چیز کو دل چاہتا تھا، یا یہ حالت ہے کہ وصل کا کیا ذکر ہے معشوق نظر تک اٹھا کر نہیں دیکھتا، اس مایوسی کی حالت میں اگر اتفاقاً اس نے کبھی گالی بھی دیدی تو خوش ہوتا ہوں کہ آگے کے لئے امید بندھتی ہے،

کس از معانقۂ روزِ وصل یابد ذوق　　کہ چند شب بہ ہم آغوشِ خود جدا خفت ست

شد عمر و سرگرانیٔ او برطرف نشد　　با ما بقدر مرتبۂ عشق ناز کرد

پایم بہ پیش از سرِ این کوئے رو　　یاران خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست

مُردم از شرمندگی، "تا چند باہر ناکسے　　مردمت از دور بنمایند وگویم" یار نیست"

ایک خاص واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے، حالت یہ ہے کہ معشوق اکثر کمینوں اور بوالہوسوں کے ساتھ رہتا ہے، لوگ جب اس کو کہیں، راستہ میں کمینوں کے ساتھ جاتا ہوا دیکھتے ہیں تو دور سے عاشق (نظیری) کو دکھا کر کہتے ہیں، دیکھو تمھارا یار جاتا ہے، عاشق غیرت کے مارے کہتا ہے کہ نہیں میرا معشوق نہیں کوئی اور ہوگا،

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار — چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

باعث راندنم نے بزم بجز عار نبود — ورنہ کس را بمن وبودن من کار نہ بود

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود — امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

یعنی معشوق نے ذرا سی مہربانی سے بات کہی اور تمام شکایتیں جاتی رہیں،

مرا بسادہ دلیہای من تواں بخشید — خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

می گریم واز گریہ چو طفلاں خبرم نیست — در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام ست

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں عشقیہ درد اور گداز پیدا ہوتا ہے لیکن ابھی کوئی معشوق متعین نہیں، اس لئے وہ سمجھ نہیں سکتا کہ یہ حالت کیوں ہے، اور اس کی تمثیل کس قدر عمدہ دی ہے، بچے روتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کیوں روتے ہیں؟ کیونکہ ان کو جو تکلیف ہے اس کے سمجھنے کی ان کو عقل نہیں،

ہماں عشق ست بر خود بستہ چندیں داستاں ورنہ — کسے بر معنی یک حرف صد دفتر نمی سازد

بغل نامۂ احباب پر کردو نے خواند — کہ می ترسد، شود مکتوب من ہم از میاں پیدا

عاشقوں کے خطوط کا چنگ ہاتھ میں ہے، لیکن کھول کر پڑھتا نہیں کہ کہیں میرا خط نہ نکل آئے،

من نخواہم رفت اما بہر تسکین دلش — ہر کجا بینید گوئیدش کہ فردا می رود

یعنی میں اس کی گلی سے جاؤں گا تو نہیں، لیکن تم لوگ اس سے ملنا تو کہدینا کہ کل چلا جاؤنگا،

غنج و افسوں زلیخا کار در یوسف نہ کرد — ہر کہ دل در باخت دل بردن نمیداند کہ چیست

نوازشے زکرم می کند محبت نیست — تواں شناختن از دوستی مدارا را

یعنی معشوق جو مہربانی کرتا ہے، انسانیت کے لحاظ سے کرتا ہے، محبت نہیں، محبت اور

مدارا میں جو فرق ہے اس کی تمیز خود ہوسکتی ہے،

نظیری کوی عشق ست این نہ شاہد بازی و رندی — کہ گر یارے رود از دست کس یارے دگر گیرد

مشو از حالِ من غافل کہ زخمے کاری دارم — مبادا دیگرے صید ترا از خاک برگیرد

بھر زخمے کہ می گیرند کالائے وفا خوب ست — پس از عمرے گذر افتاد بر من کاروانے را

سوائے کن زمن امروز تا غوغا بشہر افتد — کہ اعجاز فلانی کرد گویا بے زبانی را

بلبل چو پر شکست، تماشا بما رسید — در بزم چوں نماند کسے جا بما رسید

۵- نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے، لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہی،

بر چہرۂ حقیقت اگر ماندہ پردۂ — جرم گناہِ دیدۂ صورت پرستِ ماست

چند از مؤذن بشنوم توحید شرک آمیز را — کو عشق تا یکسو نہم، شرع خلاف انگیز را

خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم — باز می باید ز سر گیرم رہِ پیمودہ را

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو دلیلیں ہمارے سامنے پیش کی گئیں، یا جو مسائل ہمارے سامنے آئے وہ صحیح تھے، لیکن ہم نے اپنی بے پروائی یا کج طبعی یا گُریزی کی وجہ سے اُس سے فائدہ نہیں اٹھایا، اس لئے ہم کو نئے دلائل کی ضرورت نہیں، انہی دلائل کو غور سے مکرر دیکھنا چاہئے، اسی خیال کو اس شعر میں ادا کیا ہے،

ہرگز عطائے ساقی ما را کرانہ نیست — از تنگ ظرفی ست کہ پیمانہ پُر شدہ است

زیں پیش شیشۂ دل با ہم زسنگ بود — بے نسبت آشنا دلِ ما با دلِ تو نیست

شیشہ پتھر سے بناتے ہیں، اس بنا پر کہتا ہے کہ میرے دل کو جو تیرے دل سے ربط ہے بے وجہ نہیں ہے، یہ شیشہ بھی (عاشق کا دل) پہلے پتھر تھا، (معشوق کا دل پتھر ہوتا ہی) اس لئے ایک قسم کی مناسبت ہے،

اس شعر میں میلانِ جنسیت کے مسئلہ کو عاشقانہ پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ہیچ کس نامۂ سربستۂ ما فہم نکرد نہ ہمیں خاتمہ اش نیست کہ عنوانش نیست

یعنی دنیا کے آغاز و انجام کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی،

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم گوش نزدیک بلب آر کہ آوازے ہست

یعنی جو کچھ کہتا ہوں دل میں القا ہوتا ہے تب کہتا ہوں،

گر عکسِ روے خویش در آئینۂ دیدۂ توحید شیخ و شرک برہمن بجا شناس

یعنی توحید اور شرک دونوں صحیح ہیں، کیونکہ بت میں بھی کوئی جلوہ ہے جس پر برہمن نثار ہے،

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

یعنی خشک طبع زاہد، معرفتِ الٰہی کی طرف یوں نہیں مائل ہو سکتے، اس لئے ان کو حور اور جنت کی چاٹ دلائی جاتی ہے، اس لالچ سے جب وہ ذکر اور شغل میں مصروف ہوتے ہیں، تو رفتہ رفتہ جذبِ الٰہی بھی پیدا ہو جاتا ہے،

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد کفر آورد م و در عشقِ تو ایماں کردم

کفر و ایماں نبود شرط نظیری در عشق بتو کافر بنمایم کہ ولایت دارد

روے نکو معالجۂ عمر کوتہ است ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

ما را چہ اعتبار و اثر با وجود دوست جائے کہ جلوہ کرد حقیقت مجاز نیست

حسن ہر سو در لباسِ دیگرے پنہاں شود عشق ہر ساعت در آویزد بدامانِ دگر

بہر کارے کہ ہمت می گماری نصرت از حق جو کہ بر گنجشک دام افگندم و صید ہما کردم

تا کے چو موجِ آب بہر سو شتافتن در عین بحر پاے چو گرداب بند کن

دریں میدانِ پرنیرنگ حیران ست دانائے ۔۔۔ کہ یک ہنگامہ آرائی ست و صد کشور تماشائے

در طبع دوستان ز حسد راستی نماند ۔۔۔ انصاف اگر طلب کنی از دشمنان طلب

تعجب یہ ہے کہ نظیری اگرچہ نہایت مذہبی آدمی تھا، اور اکبر اور ابو الفضل کی لا مذہبی پر نہایت لعن طعن کرتا ہے لیکن خود وہی خیالات ظاہر کرتا ہے جو اُس زمانے میں ابو الفضل وغیرہ کی طرف منسوب تھے، چنانچہ کہتا ہے،

بوالبشر را قوائے ملائکہ اند ۔۔۔ جزو کل راست در سجود ایں جا

حضرت آدم ؑ کے قویٰ بھی فرشتہ ہیں ۔۔۔ اور جزو، کل کو سجدہ کر رہا ہے

نزد تو جبرئیل وحی آورد ۔۔۔ عقل برقع ز رخ کشود ایں جا

تمھارے نزدیک تو جبرئیل وحی لائے ۔۔۔ لیکن در اصل وہ خود عقل تھی

۶۔ اس زمانے کے تمام نامور شعرا کا اصلی جوہر، طرز ادا کی جدت ہے، نظیری اس میدان میں اکثر حریفوں سے آگے ہے،

عشق را کام بعہدِ دلِ خود کام تو نیست ۔۔۔ صبحِ امید و شبِ وصل در ایامِ تو نیست

گویا اس میں ایک صبح اور ایک رات کم ہے،

از کف نمی دہد دل آسان ربودہ را ۔۔۔ دیدیم زہر بازوئے ناآموزدہ را

بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع و نہ آفتاب ۔۔۔ بام و درم ز ذرہ و پروانہ پُر شدہ است

میرے گھر میں کون آیا ہے کہ نہ دھوپ ہے نہ شمع، باوجود اس کے در و دیوار پر ذرے اور پروانے ٹوٹ پڑے ہیں (یعنی معشوق آفتاب بھی ہے اور شمع بھی)

بے تو دوشم در درازی از شبِ یلدا گذشت ۔۔۔ آفتابِ مروزچوں برق از سرائے ما گذشت

ہیبتِ حسنش کسے را رخصتِ آہے نداد ۔۔۔ گرچہ ہر سو دادخواہی بود، او تنہا گذشت

در آرزوے نثارِ قدومِ تو ہمہ شب گہر فروش دو چشمِ مرادکان بازست

دعا کنید بوقت شہادتم اور ا کہ این دمے ست کہ درہای آسمان بازست

اس شعر میں جدتِ ادا کے ساتھ ایثارِ نفس کے مضمون کو نہایت بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے، عاشق قتل کیا گیا ہے، اس تقریب میں آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں اُس حالت میں عاشق کو سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ معشوق کے حق میں لوگوں کو دعا کرنی چاہیے، کیونکہ یہ قبولِ دعا کا وقت ہے،

عارفان گوشۂ چشمے بدو عالم ندہند ہر کجا یار نقاب از رخِ زیبا برداشت

ع این قبلۂ کہ کج شدہ طرفِ کلاہ کیست

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست ہم بجانِ تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

اس شوخی کو دیکھو، کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تمھاری جان کی قسم کھانا اچھی بات نہیں لیکن تیری جان ہی کی قسم کہ مجھ کو اور کوئی قسم یاد ہی نہیں، شوخی اور بلاغت یہ ہے کہ قسم نہ کھانے پر بھی قسم کھائے جاتا ہے' اور اس لطف سے کہ گویا اس کو خبر نہیں کہ اس نے قسم کھالی، اسی میں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اس کو اور کوئی قسم یاد نہیں،

قسمت چنیں فتاد کہ ترکانِ مستِ او در دورِ ما بطاق نہادند جام را

کہنا یہ تھا کہ ہم معشوق کی نگاہ سے محروم ہیں، اسکو یوں کہتا ہے کہ ہماری قسمت ایسی واقع ہوئی کہ ہمارے زمانے میں ان ترکوں (معشوق کی آنکھیں) نے پیالہ اٹھا کر طاق پر رکھدیا، اور شراب پینی پلانی چھوڑ دی،

ہیچ دل را ستم حادثہ مجروح نہ کرد کہ نہ لعلِ تو بر و ریخت نمکدانے چند

تو گر برہم زنی سودائے دل نازنے زیان داری مرا سرمایۂ دنیا و دیں نابودی گردد

یعنی دل کی خرید و فروخت کا جو معاملہ طے ہو چکا ہے، اس کو تو اگر توڑ دے تو تیرا صرف ایک ناز ہی کا نقصان ہوگا، لیکن میرا تو دین اور دنیا کا جو کچھ سرمایہ ہے (یعنی دل) سب جاتا رہیگا

چناں برہم زدی ہنگامۂ شور قیامت را   کہ اکثر نامۂ اعمال مردم از میاں گم شد

باتو گستاخی ست گفتن ترک بدخوے نما   بادلِ خود گفتہ ام آئینہ را بے سنگ ساز

مقصد یہ ہے کہ معشوق تو بدمزاجی چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے میں نے اپنے دل کو برداشت کرنے کی عادت ڈال دی ہے، اس مطلب کو یوں ادا کرتا ہے (معشوق سے مخاطب ہوکر تم سے یہ کہنا تو گستاخی ہے کہ بدمزاجی چھوڑ دو، لیکن میں نے اپنے دل سے کہہ دیا ہی کہ آئینہ ایسا بناؤ جس کو زنگ نہ لگنے پائے،

بدل طرحِ وصال جاودانی نقش می بندم   اگر خود دوست می آید بخلوت دشمن ست امشب

عشق بازیم بمعشوق مزاجی انداخت   زاں نیازے کہ بہ او ہست مرا نازے ہست

یعنی عشق کرتے کرتے مجھ میں معشوق مزاجی آگئی، مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں اسکا نیازمند ہوں،

میخواست بوسہ رخت اقامت بگسترد   از فرشِ جبہ راہ براں خاک کو نبود

مقصد یہ ہے کہ میں اس کی گلی کی خاک کو بوسہ دینا چاہتا تھا، لیکن اس قدر کثرت سے لوگ پیشانی رگڑ رہے تھے کہ جگہ نہ تھی، اس مطلب کو یوں ادا کرتا ہے کہ بوسہ نے چاہا کہ وہاں قیام کیلئے بستر بچھائے، لیکن پیشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا، اس لئے جگہ نہ تھی،

دہر چوں در دشمنی ست افگندم بہر   دشمنِ نامرد را من مرد میداں نیستم

دریں عشرت کہ من جاں می سپارم   نمی گرید بہ گم ما در م امروز

قاصد کہ می فرستی رطل گرانش در دہ   کز ما خبر نیابد تا بے خبر نباشد

یعنی قاصد جو بھیجنا تو خوب شراب پلوا کے بھیجنا؛ کیونکہ جب تک خود بے خبر نہ ہوگا، میری

خبر اس کو نہ معلوم ہو سکے گی، مطلب یہ ہے کہ جب تک عشق آشنا نہ ہو گا، میرے عشق کا حال کیا جان سکے گا،

در دیارے کہ سجودِ خمِ ابرو رسم ست　　غیر محرابِ کج و قبلۂ ویراں مطلب

مقصد یہ ہے کہ جہاں عشق کا چرچا ہو گا وہاں زہد و عبادت کرنا بے فائدہ ہے،

گرہ بر جبینِ ابرو از چہ داری　　سرایں نامہ پیچیدہ بکشا

اگر بمعرکہ در خوں فتادہ ام چہ عجب　　ہمیشہ رزم بخود چوں تمتنی است مرا

ایک دقیق خیال کو ادا کیا ہے، کہنا یہ ہے کہ میں دوسروں کی رائے پر تو غالب آجاتا ہوں لیکن خود میرا دل میرا مخالف رہتا ہے، اور اُسکی خواہشوں کو مغلوب کرنا پڑتا ہے، اس میں مجھکو اکثر ناکامی ہوتی ہے اور نقصان اُٹھاتا ہوں، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے کہ اگر میں معرکے میں زخمی ہوا، تو کیا تعجب، کیونکہ مجھ کو اپنے جیسے رستم سے لڑنا پڑتا ہے، یعنی میں خود رستم ہوں اور اپنے آپ سے لڑتا ہوں،

کمر در خدمتت عمرے است می بندم　　شد قدم　　برہمن می شدم، گر ایں قدر زنار می بستم

۷۔ وہ غزلوں میں کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے اور غزل کی غزل اسی ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے، ان موقعوں پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مضمون کی تمام جزئیات کو کس طرح احاطہ کرتا ہے، کس خوبی سے تسلسل بیان کو قائم رکھتا ہے، کس طرح عشق و عاشقی کی ایک ایک ادا سے واقف ہے، اس کے ساتھ رنگینی استعارات، جدتِ اسلوب اور شیریں زبانی، کلام کو سحر سامری بنا دیتی ہے، مثلاً ایک غزل میں وصل کی حالت ادا کرتا ہے،

دارم دریں دیار مغاں شیوہ دلبری　　بیخود خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش

اس شہر میں میرا ایک معشوق ہے جس کی ادائیں مغبچوں کی سی ہیں، وہ مستی میں بھی، ہوش میں بھی

اور درمیانی حالت میں بھی خوش ادا ہے،

دستار افگند خمِ کاکل پراگند — کاین ست وضعِ صحبت وزین سان نگار خوش

ٹوپی اتار کر رکھ دیتا ہے اور بالوں کو بکھرا دیتا ہے، اس لئے کہ صحبت کا یہی انداز ہی، اور معشوق اسی رنگ میں دلکش معلوم ہوتا ہے،

شاد و شگفتہ، مطرب و ساغر طلب کند — یک سو نہد حجاب و در آید بکار خوش

خوشی سے کھل جاتا ہے اور مطرب اور شراب طلب کرتا ہے، شرم اٹھا دیتا ہے اور کام میں لگ جاتا ہے،

ہرگند کند شتاب بہ رفتن کہ دیر شد — تسکین دہم دلش کہ سکون و قرار خوش

جب جانے کے لئے جلدی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیر ہوئی جاتی ہے تو میں اسکو روکتا ہوں کہ سکون اور قرار اچھی بات ہے،

تا دم زند کہ روز چہ رفت و ز ہفتہ چیست — نگذارمش شمار کہ نبود شمار خوش

جب یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کون سا ہفتہ ہے؟ اور دن کتنا چڑھا؟ تو میں اس کو یہ پوچھ گچھ کرنے نہیں دیتا، کیونکہ پوچھ گچھ اچھی بات نہیں،

او در وداع و من بجزع کز می و بہار — رطلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خوش

وہ رخصت ہونا چاہتا ہے اور میں روتا ہوں کیونکہ شراب اور بہار میں سے یہی دو تین پیالے اور دو تین دن مزے کے رہ گئے ہیں،

ساغر کنم لبالب و گویم سبک بنوش — در موسم بہار نہ باشد خمار خوش

میں پیالہ بھرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آہستہ سے چڑھا جا کیونکہ بہار میں خمار اچھی چیز نہیں،

چنداں کہ گویمش گذران ست عمر باش — گوید صبا روانہ بہ وگل سوار خوش

میں ہر چند کہتا ہوں کہ عمر گذری جاتی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ، وہ کہتا ہے کہ صبا کا روانہ ہونا ہی اچھا ہے، اور پھول کا سفر کرنا ہی بہتر ہے،

کارے بہ لابہ پیش نظیری نمی رود / باشد باو گذاشتن اختیار خویش

اے نظیری! اب خوشامد کچھ پیش نہیں جاتی اسلئے اب اسی کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے،

ایک غزل میں یہ حالت بیان کی ہے کہ معشوق خود کسی حسین پر عاشق ہو گیا ہے، اس حالت میں جو جو واقعات پیش آسکتے ہیں، ان کو بیان کیا ہے، اور کس دلآویزی سے بیان کیا ہے

چشمش براہے میرود مژگانِ تمنا کش نگر / در سینہ دارد آتشے، پیراہنِ چاکش نگر

دامے کہ زلف انداختہ در گردنِ سیمینش بیں / خونے کہ مژگاں ریختہ بر دامنِ پاکش نگر

زلف نے جو جال ڈالا تھا، اب خود اس کی سیمیں گردن میں ہے، مژگاں نے جو آنسو گرائے ہیں اسکے پاک دامن پر پڑے ہوئے ہیں،

شرم از میاں برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ / گفتارِ بے ترتیش بیں، رفتارِ بیباکش نگر

شرم اور حجاب جاتا رہا، زبان کھل پڑی، اسکی بے جھجک باتیں اور بیباکانہ رفتار دیکھنے کے قابل ہے

از کوی معشوق آمدہ شوریدگاں در حلقہ اش / از صید آہو می رسد شیراں بفتراکش نگر

معشوق کی گلی سے آیا ہے، اور عاشقوں کا جھرمٹ ساتھ ہے، ہرن کو شکار کرکے آیا ہے اور فتراک میں شیر ہیں

دل بردہ و دل باختن معشوقِ عاشق پیشہ بیں / بگرفتہ در انداختن بازوے چالاکش نگر

عاشقی میں معشوقی دیکھو کہ دوسرے کو دیتے دیتے خود اس کا دل اڑا لیا،

۸۔ نظیری نے روزمرہ اور محاورات نہایت کثرت سے برتے ہیں، جس سے زباندانی میں بہت مدد ملتی ہے، اس کے ساتھ اکثر محاورات وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا ہے، بغیر اس محاورہ کے وہ اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوسکتا تھا، مثلاً

سے اس کا اندازہ ہو گا،

ع طفل بودیم کہ بازار شکر و شیر شدیم — از شیر باز شدن: دودھ چھڑایا جانا،

ع سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشم — حالت سخت ہی مشکل ہو کہ صبح تک بچ جاؤں

ع شبنم بروی بستر نرگس بخواب گیر — بخواب گرفتن: سوتے میں جا لینا

ع نیم بسمل شدۂ بر سر پرواز ہے ہست — بر سر پرواز: اڑنے کو ہے،

ع شرح سودائے ترا نسخہ زیبا برداشت — نسخہ برداشتن: کتاب کا نقل کرنا۔

ع شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد — افسانہ از افسانہ می خیزد: بات میں سے بات نکلتی ہے

اس قسم کے سیکڑوں روزمرے اور محاورے اس کے کلام میں مل سکتے ہیں،

طالب آملی

(ملک الشعرائے دربار جہانگیری)

سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرماں روا، سخن فہم و داد شناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے دردمند دل لے کر آیا تھا اس کا اثر اگرچہ اس نے آئین و نظامِ سلطنت میں چنداں نمایاں نہ ہونے دیا، یہانتک کہ تزک میں نور جہاں کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لیکر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لئے شعر و شاعری کا نکتہ داں اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا شہزادگی کے زمانہ سے شعرا اس کے دربار میں ملازم رہتے تھے، تختِ سلطنت پر بیٹھا تو دربار شعرا سے بھرا ہوا تھا لیکن ملک الشعرائی کا تاج اس نے طالب آملی کے سر پر رکھا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ شاعر کس پایہ کا ہوگا، یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس وقت طالب کا سن ۲۰ برس سے زیادہ نہ تھا، اس عمر میں یہ اعزاز، خاص اسی شاعر کا کارنامۂ اقبال ہے،

طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، یہیں میں درسی علوم و فنون کی تعلیم پائی، اور اگر اس کے دعوی پر اعتبار کیا جائے تو ۱۵-۱۶ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوش نویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

پابردہمین پایۂ اوج عشر اتم	وانیک عدد فہم از آلاف زیاد است
بر ہندسی و منطق و ہیئت و حکمت	دستی است مرا کش ید بیضا زعباد است
وین جملہ چو طے شد نگین علم حقیقت	کاستاد علوم ست برین جملہ مزاد است
در سلسلۂ وصف خط این بس کہ ز کلکم	ہر نقطہ سویدائے دل اہل سواد است
پوشم نسب شعر، چو دانم کہ تو دانی	کایں پایہ مرا تا من این جمع شداد است

گو رواجِ عام کے لحاظ سے اس نے یہ تمام علوم حاصل کیے، لیکن وہ دراصل شاعری کے لئے پیدا ہوا تھا، اس لئے اسی کو اپنا فن قرار دیا،

اس زمانہ میں مازندران کا حاکم جس کو ایران کی اصطلاح میں وزیر کہتے تھے، میر ابوالقاسم تھا، اس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے، ایک قصیدہ کا یہ مطلع ہے، اور غالباً یہ پہلا قصیدہ ہے،

سحر کہ غنچہ کشاید گرہ ز پیشانی	زند دم از دم عیسیٰ نسیم بستانی
سحر کہ طرۂ پیچانِ مشک سای نسیم	بطرفِ عارضِ گلبن کند پریشانی

معلوم نہیں کہ کن اسباب سے یہاں طبیعت سیر ہوئی اور کاشان میں آیا، یہاں مستقل سکونت اختیار کی، اور شادی بھی کر لی، تذکرۂ میخانہ میں لکھا ہے کہ اسکی شاعری کا نشو و نما یہیں ہوا، لیکن چند روز کے بعد یہاں سے بھی برداشتہ خاطر ہو کر مرو میں آیا، یہ عباس صفوی کا زمانہ تھا اور بکتش خاں صوبے کا گورنر تھا، طالب نے بکتش خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور مدحیہ قصائد لکھے، دو برس تک یہاں قیام رہا، بکتش خاں نے قدر دانی میں کمی نہ کی ہوگی لیکن طالب ہندوستان کی فیاضیوں کا خواب دیکھا کرتا تھا، ایک مثنوی لکھ کر بکتش خاں سے وطن جانے کی اجازت حاصل کی، ابتدا میں لمبی چوڑی تمہید لکھی، پھر حرفِ مطلب اس طرح ادا کیا،

۱ یعنی ابھی میں نے دوسری دہائی میں قدم رکھا ہے،

یکے بر حرف طالب گوش بکشائے
صدف را بر گہر آغوش بکشائے

دو سال آمد کہ از محنت کشان است
ترا چوں بوسہ فرش آستان است

بہ کلی کردہ از مسکن فراموش
یکے گم دیدہ زنئے خانہ بر دوش

نہ از خویشاں کند نزد اقربا یاد
بدیدار تو دارد خویش را شاد

اگر لطف تو اش دستور بخشد
چو خور کو ذرہ را نور بخشد

عناں سوئے وطن تابیدہ چندی
کند خویشان خود را ارجمندی

دو روزے با غم آشناماں سر آرد
دگر رہ سوئے طوف ایں در آرد

بدیں در گہ رساند خویشتن را
ز سر بیروں کند شور وطن را

وطن کا بہانہ تو اس لئے تھا کہ ہندوستان کا نام لیتا تو اجازت کیونکر ملتی، ملکش خاں سے رخصت ہو کر، طالب نے سیدھا ہندوستان کا راستہ لیا اور اس وقت یہ رباعی لکھی، [۱]

طالب اگل ایں چمن بہ بستاں بگذار
بگذار کہ می شوی پشیماں بگذار

ہندو نہ برد تحفہ، کسی جانب ہند
بخت سیہ خویش بہ ایراں بگذار

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں کالی چیز، تحفہ لے کر نہیں جاتے، اس لئے بخت سیہ کو یہیں چھوڑ کر چلنا چاہئے،

میخانہ کے مصنف نے جو خود طالب کا ہمعصر اور ہم صحبت تھا، لکھا ہے کہ طالب مرو سے نکل کر سیدھا قندھار پہنچا، لیکن یہ تعجب انگیز غلطی ہے، قندھار جانے کا حال طالب نے خود ایک قصیدہ میں لکھا ہے، اس سے صراحۃً ثابت ہے کہ وہ ہندوستان میں برسوں رہ کر قندھار گیا ہے، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے،

---

[۱] تذکرہ میخانہ،

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل جب وہ ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کو کامیابی نہیں ہوئی، اور اس وجہ سے وہ تمام مشہور مقامات میں بہ تلاشِ معاش پھرتا رہا، دلی، لاہور، ملتان، سرہند ان مقامات کا ذکر اس نے بہ تخصیص کیا ہے، لاہور میں زیادہ دل لگا چنانچہ لاہور کی مدح میں ایک خاص قصیدہ لکھا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں،

گمانم نیست کاندر ہفت کشور — بود شہرے بہ آب و تابِ لاہور
میان بکشا و خوش داکش کہ در ہند — فراغت نیست جز در خوابِ لاہور

یہاں اس نے شاہ ابو المعالی کی خدمت میں بیعت حاصل کی، چنانچہ کہتا ہے،

کنم زاں رو مرید آسا شب و روز — کرامتہا بیاں در بابِ لاہور
کہ پیر و دستگیر و مرشد من — یکے قطب است از اقطابِ لاہور
خدایا زندۂ جاوید دارش — بہ آبِ خضر یعنی آبِ لاہور

ان شہروں میں وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمنِ حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا، خوش قسمتی سے حسینوں نے بھی اپنے پہلو میں اسکو جگہ دی، چنانچہ جب ہندوستان چھوڑ کر قندھار جانے لگا ہے تو جس گرمجوشی سے ان فتنہ گروں نے اسکو روکا ہے، اسکی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

نگارانِ لاہور و خوبانِ دہلی — بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکے چہرہ سودے بچشم رکابم — یکے بوسہ دادے بزلف عنانم
فشاندی یکے در بغل یاسمینم — نہادے یکے در دہاں برگِ پانم
غزالانِ ملتان بہ نیرنگ سازی — کہ بندند از غمزہ دست و دہانم
من از جملہ چوں نکہت گل گریزاں — کہ خود را بزمِ ہمایوں رسانم

اس زمانہ میں غازی خاں وقاری، امرای جہانگیری میں نہایت ممتاز تھا، اس کا

باپ مرزا خانی ۱۰۰۱ھ ہجری میں اکبر کے حکم سے ٹھٹھہ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا، ۱۰۰۸ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو غازی خاں باپ کا جانشین ہوا، جہانگیر نے اپنے عہد سلطنت میں اس کو قندھار کا گورنر مقرر کیا، اور سندھ کا علاقہ جاگیر میں دیا، وہ نہایت قابل اور دریا دل تھا، اکثر اہل کمال مثلاً اسد قصہ خواں، مرشد بروجردی میر نعمت اللہ وغیرہ نے اس کے دامن تربیت میں تعلیم پائی ہے، ایران سے جو اہلِ کمال ہندوستان کا رخ کرتے تھے، ان کی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا،

شاعری میں مشہور شعرا کا ہم پلہ تھا، وقاری تخلص کرتا تھا، پانچ ہزار شعروں کا دیوان یادگار میں چھوڑا، میخانہ میں اس کے ساقی نامہ کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، غزل کا یہ ٹک ہے

در عہدِ تو مارا ہمہ با غیر خطاب است   سرپنجۂ مژگان و گریباں عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب   ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

کجاست یک دو سہ ہمدم کہ ہیچ موسیقا   نشستہ پہلوی ہم بر کشیم آوازی

غرض اس کی قدر دانی کی شہرت نے طالب کو قندھار جانے پر آمادہ کیا، پہلے ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا جس میں حاضری کی استدعا کی، تمہید کے بعد اصل مطلب اس طرح ادا کیا،

یکے بلبلِ بے پر و بالِ شوقم   کہ محرومی از طوفِ گلزار دارم

دریں خستہ آباد ذی ردی ماندن   نہ سامانِ یک گام رفتار دارم

ندانم چرا یارب ایں سان خرابم   چو لطفِ خداوندا ہمسار دارم

صف آرائے تیغ و قلم خان غازی   کہ لب در ثنایش گہر بار دارم

بلند آفتابے کہ دور از رکابش   بہ رخ کوکبِ اشکِ سیّار دارم

جدا از آستانش ز اشکِ دمادم   سرآستیں رشکِ گلزار دارم

آگرہ سے لاہور ملتان ہوتا ہوا قندھار پہنچا، چونکہ برسات کے دن تھے، راستہ میں بہت تکلیف اٹھائی، ملتان میں چار مہینے قیام کرنا پڑا، چنانچہ پہلا قصیدہ جو غازی خاں کے دربار میں پیش کیا ہے، اس میں یہ تمام حالات لکھے ہیں،

خدائے داند و من بندہ کاندریں مدت ۔۔۔ چہا کشیدہ ام از حادثاتِ دورانی
دریں سفر کہ نصیبم مباد دیگر بار ۔۔۔ بگونہ گونہ غم بید و صحبت جانی
ز اختلاطی باران بر شتگالی را ۔۔۔ ز من مپرس کہ ایں قصہ نیست پایانی
ز آگرہ[لہ] تا بخیابانِ گلشنِ لاہور ۔۔۔ رفیق بودم با ابر ہاے بارانی
بعزم ملتان چوں زورقے شدم چہلاں ۔۔۔ زد از سر شکم، نیلاب (دریا کا نام ہے)، کوس عمانی
زمکث ملتان نزدیک شد بداں کہ مرا ۔۔۔ بدل شود لقبِ آملی بہ ملتانی
دراں مضیقِ ملالت چہار مہ بودم ۔۔۔ بسانِ مہرہ بششدر، تمام حیرانی

غازی خاں نے خاطر خواہ قدر دانی کی اور مقربانِ خاص میں داخل کیا، طالب نے بہت سے پُرزور قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، جس میں مداحی سے گذر کر عاشقی کا دعویٰ کیا ہے،

تکلف نیست معشوقِ من ست او نیست ممدوحم ۔۔۔ ازاں ایں شورِ عشق آمیز در مدحش سرائیدم

بدقسمتی سے غازی خاں ۱۰۲۰ھ میں جبکہ اسکی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی، اپنے ایک غلام کے ہاتھ سے مسموم ہوا، طالب کے لئے اب کوئی ٹھکانا نہ رہا، مجبوراً اس نے پھر ہندوستان کا رخ کیا، اور آگرہ میں آیا، خواجہ قاسم دیانت خاں نے جو امراے جہانگیری میں حضور رس تھا، اس کی قدر دانی کی اور عبد اللہ خاں فیروز جنگ کے نام جو اسی سنہ میں گجرات کا حاکم مقرر ہوا تھا، اس کی سفارش میں خط لکھا، عبد اللہ خاں نے خط بھیج کر بلایا، طالب نے اس واقعہ کو

لہ آگرہ کو ایرانی شعرا ہمیشہ اکرہ لکھتے ہیں،

بڑے فخر اور ناز سے لکھا ہے[۱]،

صبا رفتار پیکے، در طلوعِ صبحِ نورانی — بگوشم زد صدائے زنگ[۲] چوں بانگِ سلیمانی

ز سیر آہنگیِ آں نغمہ مست از جائے بر جستم — بہر جانب نگاہے تاختم از روئے حیرانی

یکے باد غبار آلودہ بر در، جلوہ گر دیدم — عرق ریزاں چو مرواریدش از اطرافِ پیشانی

دویدم پیش (یعنی قاصد) و گفتم خیر مقدم، وانگہ افشاندم — بپایش مشتے از ناسفتہ گوہر ہائے مژگانی

گلاب آوردم و پیشانیش از گرد رہ شستم — دریغا کاش بودے قدرتم بر آبِ حیوانی

بپایش آشنا کردم بے و ز گرد نعلینش — نمودم سرمہ دانِ دیدہ بر کحلِ صفاہانی

پس از وے با ہزاراں شوق بیتابانہ پرسیدم — کہ اے جاروبِ راہت شہپرِ مرغِ سلیمانی

بدست آبستنِ رمزے ست گویا مژدہ داری — کہ می بارد ز رویت ہمچو گل آثار خندانی

چو بشنید ایں سخن بکشود لب انگاہ چوں طوطی — زباں را چاشنی داد از ادائے شکر افشانی

بگفت اے عندلیبِ گلشنِ معنی کہ بر یادت — قدح نوشند، خوش طبعانِ ایرانی و تورانی

بشارت باد کاینک با ہزاراں مژدہ آوردم — خطِ آزادیِ مرغِ دلت از دامِ حیرانی

در اثنائے تکلم کاغذے در جیب از گوہر — ببوسید و بدستم داد از روئے روش دانی

من آں منشورِ دولت چوں بدستِ خویشتن دیدم — شدم سر تا قدم ہمہ سجودِ شکر پیشانی

بسوئے قبلۂ گجرات رو تسلیم ہا کردم — بآدابے کہ بر من کرد گردوں آفریں خوانی

پس از تسلیم بکشودم ز عنواں مہر مشکینش — چو دیدم آفتابے چند در جلبابِ ظلمانی

شدم شاداب تر، چوں مہر عنواں را رقم دیدم — بنامِ نامیِ سرچشمۂ توفیقِ یزدانی

---

۱ آگرہ میں آنے اور قاسم خاں کی سفارش کا حال میخانہ میں لکھا ہے ۲ زنگ گھونگھرو کو کہتے ہیں، اس زمانے میں ڈاک کے ہرکارے گھونگھرو باندھ کر چلتے تھے، یہ اسکی طرف اشارہ ہے،

سحابِ فیضِ عبداللہ خاں آں مظہرِ احساں — کہ نے بحری ز دستِ ہمتش جاں برد، نے کانی

طبیعتوں کا اختلاف دیکھو! عرفی کو خود جہانگیر نے قاصد بھیج کر بلایا تھا، لیکن وہ قاصد کی نسبت اس قدر کہہ کر رہ گیا،

کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدۂ وے — چناں کہ از چمن طالعم بہ مغز شمیم

بخلاف اس کے طالب ایک معمولی امیر کے ہرکارے کے پاؤں چومتا ہے، اسکی پیشانی کی گرد گلاب سے دھوتا ہے، اور حسرت کرتا ہے کہ آبِ حیات کہاں سے لاؤں،

عبداللہ خاں نے حد سے زیادہ طالب کی عزت کی اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا[1]، طالب نے عبداللہ خاں سے درخواست کی کہ آپ دربار میں جائیں تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے چلیں، چنانچہ ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

آسماں قدرا! چو داری در خیال — عزمِ درگاہِ شہنشاہِ زماں
در جواں مردانِ ایرانی سپاہ — برگزیدہ ستے چہل شیرژیاں
گرچہ من در جرگۂ شیراں نیم — لیک از اخلاص دارم چشم آں
کز نظر چوں بگذرد تفصیلِ اسم — نامِ طالب نیز باشد درمیاں

غالباً عبداللہ خاں سے یہ خدمت انجام نہ ہوسکی، اس لئے طالب نے اور تدبیریں اختیار کیں، شاپور طہرانی ایک مشہور شاعر تھا، وہ نورجہاں بیگم سے قریبی قرابت رکھتا تھا، یعنی اس کا باپ، اعتماد الدولہ کا جو نورجہاں بیگم کا باپ تھا، حقیقی چچا تھا، وہ تجارت کرتا تھا، اور اکثر اعتماد الدولہ کے ہاں اس تقریب سے آمد و رفت تھی، طالب نے شاپور سے راہ و رسم پیدا کی، لاہور میں اس سے جا کر ملا، ایک غزل میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے،

۱؎ میخانہ،

بحمد اللہ کہ در ملکِ سخن دستور را دیدم — ہماں رشکِ عطارد شاعرِ مشہور را دیدم
بہ خسرو داشتم روئے نیازے در سخن طالب — از و در سوختم چوں صنعتِ شاپور را دیدم
چہ خوش حالم کہ بعد از مدت یک سالہ مہجوری — خوش و خوش وقت او را دیدم و لاہور را دیدم

غرض شاپور کے ذریعہ یا کسی اور تحریک سے اعتماد الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی، اعتماد الدولہ نے اس کو دامن تربیت میں لیا اور خاص توجہ مبذول کی، تذکرۂ میخانہ میں لکھا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں، اعتماد الدولہ ہی نے اس کی تقریب کی، لیکن اور تذکروں اور دیگر قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ اول اول اس کو دیانت خاں نے دربار میں پیش کیا، جو جہانگیر کی خدمت میں خاص تقرب رکھتا تھا، جہانگیر کے سامنے اس نے طالب کی اس قدر تعریف کی کہ جہانگیر نہایت مشتاق ہوا، دیانت خاں خود ساتھ لے کر گیا، لیکن طالب نے حماقت سے چلتے وقت مفرح[1] کا استعمال کیا، جس سے اس کے حواس جاتے رہے،

جہانگیر نے مہربانی سے باتیں کرنی چاہیں، لیکن طالب پتھر کی تصویر تھا، دیانت خاں کو سخت ندامت ہوئی، طالب گھر پہ واپس آیا تو اس کی معذرت میں فی البدیہہ، ۵ شعروں کا ایک قطعہ لکھ کر دیانت خاں کی خدمت میں بھیجا، مدح کے بعد جہاں سے اصل مطلب شروع کیا ہے اس موقع کے چند اشعار یہ ہیں،

بہ لطفہا کہ نمودی و می نمائی نیز — بہر غریب و مسافر علی الخصوص بمن

---

[1] یہ ایک معجون تھا جو شراب کے بجائے استعمال کیا جاتا تھا، اور محتاط اسکو شراب کے بجائے کام میں لاتے تھے، کلیم نے اسی کی طرف اس قطعہ میں اشارہ کیا ہے،

بلند قدرا سر گشتگانِ وادیِ غم — مفرح پے دفعِ ملال می خواہند
چہ بادہ بے تو حرام است ازاں نمی طلبند — حرام عیشاں زکیفِ حلال می خواہند

نخست آں کہ چو در غربتم نظر کردی — بہ مہر بردی از خاطرم ہوای وطن

چہارم آں کہ بہ بزم شہنشہم بردی — چو دل بہ پہلوی خود ساختی مرا مسکن

بپادشاہم سرگرمِ گفت وگو کردی — بمہر دیدمی خفاش را حریفِ سخن

تو آنچہ باید کردی، ولیک طالع شوم — بدستیاری گردوں نفاق زد با من

بہ بست نطق مرا بخت بد و زاں بستن — کشود بر من، ہم دوست طعنہ ہم دشمن

کرا گماں کہ چو من استعارہ پردازی — بصد زبانِ فصاحت بیاں شود الکن

کرا گماں کہ فتد رشتۂ کلام مرا — چو تارِ زلفِ عروساں شکن بروی شکن

ازیں قیاس تماشا کن کہ قدرت کیست؟ — بیک دو لحظہ چنیں قطعۂ ادا کردن

دو چیز مہر زبانِ سخنوری گردید — مرا بہ بزمِ شہنشاہ خوش عیار سخن

یکے زبونی طالع کہ دایم از اثرش — بہر دیار قرینم بہ گو نہ گو نہ محن

دگر زیادتِ نشۂ کہ نامش را — نمی توانم از شرم بر لب آوردن

ادا صریح کنم تا گمان مے نبری — چرا کہ شستہ ام از وی بہفت آب دہن

مفرحے زدہ بودم بہ قصد گفتنِ شعر — عروج نشۂ آں کرد ہرچہ کرد بمن

بہ بزم بادشہم زاں زباں نمی گردید — کہ گشتہ بود مرا خشک از زبان و دہن

سخن شناسا پیش تو چوں برآرم سر — کز انفعال سرم غوطہ خورد در گردن

نہ کردہ جرم مرا عفو کن بلطفِ عمیم — کہ خوش نماست خطای نکردہ بخشیدن

من ارچہ ہیچکسم بختِ من گنہگار است — گناہ بخت مرا لطف کن بہ بخش بمن

اعتماد الدولہ نے طالب کو مہرداری کی خدمت سپرد کی، یہ خدمت اگرچہ ایک معزز خدمت تھی، لیکن طالب شاعری کے سوا اور کسی کام کا نہ تھا، چونکہ بے دلی سے اس کام کو

انجام دیتا تھا، اس لئے ایسی بے عنوانیاں اس سے سرزد ہو جاتی تھیں، کہ اسکو شرمندہ ہونا پڑتا تھا، آخر اس نے ایک قصیدہ لکھ کر اعتماد الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، اور اس خدمت سے مستعفی ہو گیا، قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں،

دو زہر ست در ساغرم ہر دو قاتل — دو زخم است بر سینہ ام ہر دو کاری
یکی آنکہ بے خواہشِ نفس و کوشش — بر دیم شگفت ایں گلِ شرمساری
دگر آں کہ شد رنجہ یارے کہ با من — زدے مو بمویش دم از دوستداری
نیم زاہلِ دیوان بد فترچہ کارم — مرا شاعری زیبد و می گساری
بمن خدمتِ مدح فرمودن اولے — کہ بس عاشقم بر جواہر نثاری
نہ چسپد بر اہلِ سخن، شغلِ دنیا — چو بر پیر میخانہ پرہیزگاری
ز شاعر ثنا بخی آید نہ خدمت — کہ بلبل نواخواں بود نہ شکاری
خصوصاً چو من شاعرے کز تجرد — بہ رندانیاں زیبدم ہم قطاری
منت بندۂ داغدار قدیمم — بخاوم کنوں مُہرِ خود می سپاری
چو مہرِ تو دارم چہ حاجت بمہرم — مرا مہرداری بہ از مُہرداری
حق این است اما ز جرمی کہ رفتہ — ہمہ انفعالم، ہمہ شرمساری
ہمیں خجلتم دور دارد ز خدمت — چو ابلیس مجرم ز درگاہ باری
وگرنہ ہماں طالبِ حق ثناسم — ز سر تا قدم شوقِ خدمتگذاری

اعتماد الدولہ نے اس کی تقریب دربار شاہی میں کی، جہانگیر نے بلا کر زمرۂ شعرا میں داخل کیا، اور ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے:

"درین تاریخ طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ اصل او

از اہل ست ایک چندے بہ اعتماد الدولہ می بود، چوں رتبۂ سخن از ہمگناں درگذشت در سلک شعرائے پائے تخت منتظم گشت، ایں چند بیت از وست ''

اس کے بعد طالب کے چند اشعار نقل کئے ہیں، جو آگے مناسب موقع پر درج کئے جائیں گے،

جہانگیر کے دربار میں اس نے اخیر زندگی تک نہایت عزت و احترام سے بسر کی، صرف ایک موقع پر ایسا پیش آیا کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہو گیا، اور طالب چند روز تک شرفِ حضور سے محروم رہا، ایک قصیدہ میں اس واقعہ کو نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

بہ نسبت گہرم دادہ بودی از کف خویش
ترا از جود زیانے چنیں ہزار افتاد

مجھ کو موتی سمجھ کر تو نے پھینک دیا تھا
سخاوت کی وجہ سے تو نے ایسے نقصان بہت اٹھائے ہیں

چو رد شدم ز کفت چرخ از ہوا بر بود
بہ گرمی کہ ز بانم بز نہار افتاد

جب تو نے مجھ کو پھینک دیا، تو آسمان نے اٹھا لیا
اس گرمجوشی کے ساتھ کہ خود میں پناہ مانگنے لگا

یکے مقابل خورشید داشت آئینہ ام
بدید کز عرقش موج بر عذار افتاد

تھوڑی دیر تک آسمان نے میرے آئینہ کو آفتاب کے سامنے رکھا
اور دیکھا کہ آفتاب کے چہرے پر پسینہ آگیا

چو پیش مشعل مہ برد شب چراغ مرا
بچہرہ گو نہ اکاہیش شمع دار افتاد

پھر چاند کے مشعل کے سامنے کیا
اس کا چہرہ شمع کی طرح زرد پڑ گیا

ازیں نشاط گر دست آسمان لرزید
کہ باز در کفِ خاقانِ کامگار افتاد

اس خوشی سے آسمان کا ہاتھ کانپا
اور دوبارہ میں بادشاہ کے ہاتھ میں آ گرا

کنوں بر شتۂ مہرش بدار کز تقدیر
دو بار در کفت ایں در شاہوار افتاد

اے بادشاہ! اب مجھ کو محبت کی لڑی میں پرولے
کیونکہ دو دفعہ یہ موتی تیرے ہاتھ سے گر چکا

طالب نے ۱۰۳۶ھ میں، یعنی جہانگیر کے مرنے سے ایک برس پہلے عین شباب میں وفات پائی،

اعزہ واولاد

طالب کی ایک بہن تھی، جس کا نام ستی النسا تھا، جس کو طالب ماں کی برابر سمجھتا تھا، اس کو طالب کے ساتھ اس قدر محبت تھی کہ صرف اس سے ملنے کے لئے ایران سے آگرہ میں آئی، طالب اس وقت جہانگیر کے ساتھ دورہ میں تھا، بہن سے ملنے کے لئے اجازت طلب کی اور یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا،

صاحبا! ذرہ پرورا! عرضے — بزبان سخن ورا ست مرا
پیر ہمشیرہ ایست غم خوارم — کہ باو مہرِ ما دراست مرا
چار دہ سال بلکہ بیش گذشت — کز نظر دور منظراست مرا
دور گشتم ز خدمتش بعراق — دین گنہ جرم منکراست مرا
او نیاورد تابِ دوری من — کہ بہ مادر برابراست مرا
آمد اینک بہ آگرہ وز شوقش — دل طپاں چوں کبوتراست مرا
می کند دل بسوی او آہنگ — چہ کنم شوق رہبراست مرا
گر شود رخصت زیارتِ او — بہ جہانے برابراست مرا

اس کی شادی نصیرای کاشی سے ہوئی تھی، جو مرزا صائب کے استاد مسیح کاشی کا حقیقی بھائی تھا، نصیرا کی وفات کے بعد ستی النسار ممتاز محل (زوجۂ شاہجہاں) کی پیش خدمت مقرر ہوئی، چونکہ نہایت قابل، خوش تقریر، اور خانہ داری کا خاص سلیقہ رکھتی تھی، اسکے ساتھ علم طب میں اس کو مہارت تھی، ممتاز محل نے اس کو مہر داری کی خدمت سپرد کی، فارسیت اور فن قرأت کی واقفیت کی وجہ سے جہاں آرا بیگم کی تعلیم بھی اس کے متعلق

کی گئی، ممتاز محل کے مرنے کے بعد شاہجہاں نے اس کو حرم شاہی کا صدر کل یعنی مدارالمہام مقرر کر دیا،

طالب کے اولاد ذکور نہ تھی، دو لڑکیاں تھیں، ستی النسا نے ماں کی حیثیت سے پالا، بڑی کی شادی عاقل خاں، اور چھوٹی کی، ضیاء الدین خاں سے کی، ستی النسا چھوٹی لڑکی کو بہت چاہتی تھی ۲۰؁ جلوس مطابق ۱۰۵۶؁ شاہجہانی میں اس نے بمقام لاہور وفات پائی، ستی النسا اس کے ماتم میں سوگ نشین ہوئی، شاہجہاں نے خود اس کے پاس جاکر ماتم پرسی کی اور محل میں ساتھ لایا لیکن ستی النسا کو ایسا سخت صدمہ پہنچا تھا کہ حرم سے واپس آکر اسی دن مرگئی، شاہجہاں نے دس ہزار روپیے تجہیز و تکفین کے لئے عطا کئے، اور حکم دیا کہ لاش محفوظ رکھی جائے، تاج محل کی قبر کے پچھم جانب جلو خانہ سے متصل تیس ہزار روپیے کی لاگت سے مقبرہ کی تیاری کا حکم دیا، جو سال بھر میں بن کر تیار ہوا، کچھ اوپر ایک سال کے بعد لاہور سے لاش منگوا کر مقبرہ میں دفن کی اور مقبرہ کے اخراجات کے لئے ایک گاؤں عطا کیا جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار روپئے تھی،

تیموریوں کی یہی شاہانہ قدر دانیاں تھیں جنھوں نے ان کے آستانے کو دنیا کے اہلِ کمال کا قبلۂ حاجت بنا دیا تھا،

عام حالات اور اخلاق و عادات عبد النبی فخر الزمانی جو تذکرۂ میکدہ کا مصنف اور طالب آملی کا معاصر تھا اس کے حالات میں لکھتا ہے،

آں بلبل دستاں سرا، در ہماں سال کہ ۱۰۲۸؁ بود بدار الخلافت آگرہ آمد، ایں ضعیف را مرتبۂ اول درعہد دراں ایام باو ملاقات واقع شد، جوانی دید

۱؎ یہ پوری تفصیل مآثر الامراء جلد دوم ص ۷۹۱ و ص ۷۹۲ میں ہے،

بہ انواعِ ہنر آراستہ، چناں خلیق و زود آشنا کہ دریں فن نیز عدیل نداشت در مثنوی خویش خویش دو سہ بیت در دوست آشنائی خود بیان فرمودہ حقا کہ حالی او ست و دراں تکلفے نہ کردہ، آں ابیات این ست،،

کتب طے کردہ ام در دستداری — یکے علامہ ام در علمِ یاری

سزد آناں کہ علم مہر دارند — دریں فنم وحید الدہر خوانند

بناشد بیوفائی در بساطم — وفا یک گل بود از اختلاطم

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طالب نہایت دوست پرور، وفا شعار اور خوش اخلاق تھا، زمانہ کی ضرورتوں نے اگرچہ اس سے در در کی خاک چھنوائی، یہانتک کہ شیدا نے اسکی ہجو میں کہا،

شب و روز مخدومنا طالبا — پے جیفۂ دنیوی در تگ است

مگر قول پیغمبرش یاد نیست — کہ دنیا است مردار طالب[له] سگ است

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرۃً غیور اور خود دار تھا، غازی خان کے دربار میں پہونچ کر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ پھر کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلائیگا، لیکن اسکی بدقسمتی تھی کہ غازی خاں جوانامرگ ہوگیا،

عبد اللہ خاں ناظم گجرات نے اسکی قدردانی میں کمی نہیں کی، لیکن صحبت بے میں تھی، عبد اللہ خاں کو شعر و شاعری سے کچھ لگاؤ نہ تھا، اس لئے وہ طالب کی سرپرستی لازمۂ امارت کی حیثیت سے کرتا تھا، اور طالب اس کو پسند نہیں کرتا تھا، اعتماد الدولہ نے خود اس کو جہانگیر کے دربار میں پہنچایا، اور بہت سے حکم کھا کر اب وہ اصلی مرکز پر آیا،

طالب نے ہر موقع پر اپنی آن قائم رکھی، اعتماد الدولہ کے نام اس نے ایک منظوم خط لکھا ہے، اس میں لکھتا ہے کہ شاعری دو قسم کے لوگ اختیار کرتے ہیں، ایک وہ جست ہمت

له الدنیا جیفة و
طالبها کلاب کی
اشارہ ہے

جو پیشہ کی حیثیت سے اس کام کو کرتے ہیں، دوسرے، وہ عالی طبع جن کو فطرۃً خدا نے شاعر بنایا ہے،

دو صنف اند اہل طبیعت کہ ہر یک — ندارند باہم سر سازگاری
یکے را فرومایگی کرد شاعر — یکے را بزرگی و عالی تباری
یکے اضطراری است انشای نظمش — یکے راست شغلِ سخن اختیاری
یکے را عُلوِّ طبیعت بجاے — کہ دزدد سر از سایۂ تاجداری
یکے آں چناں پست فطرت کہ بالد — بخود از خطابِ فصاحت شعاری
یکے را طمع گشتہ ہادی ایں راہ — یکے را جوانی و ہنگامہ داری

ان دونوں قسموں کی تفصیل لکھ کر پوچھتا ہے،

گدا شاعر و میرزا شاعری ہست — ندانم مرا بر چہ ہنجار داری.

یعنی دو قسم کے شاعر ہوتے ہیں، "گدا" اور "میرزا"، فرمائیے، آپ مجھ کو کس قسم میں شمار کرتے ہیں؟ پھر خود جواب دیتا ہے،

من از شاعری شکر للہ کہ دارم — بہ بختِ بلند تو امیدواری
کہ گر، دہر یک دانہ یاقوت گردد — در و بینم از چشم بے اعتباری
بہ گلزار معنے ہزار فصیحم — بہ منصب چہ شد نیستم گر ہزاری
ز آزادگانم تعلق ندانم — مرا نیست با اہل شیوہ کاری

جہانگیر نے ایک دفعہ نشہ کے ترنگ میں حکم دیدیا تھا کہ مقربان خاص ڈاڑھی ترشوا کر شریک صحبت ہوں، طالب نے اس حکم کی تعمیل سے سرتابی کی، اور گھر میں بیٹھ رہا، پھر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، جس میں غیر حاضری کی یہ معذرت کی،

تراشید گانند یک سر سپاہ | کسے را چو من تیرہ پرگاہ نیست
بہ بزمے کہ موے نہ گنجد درو | شدن با دو گز ریش دلخواہ نیست
بہشت است بزم تو دور از بہشت | منِ ناتراشیدہ را راہ نیست

یعنی ایسی محفل میں جہاں ایک بال کی گنجایش نہیں، دو گز کی داڑھی لیکر جانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، آپ کی محفل بہشت ہے، اور بہشت میں مجھ ناتراشیدہ کا گذر نہیں ہو سکتا، پھر ایک اور قطعہ لکھا،

سفر می کنم صاحبا[1] ورنہ من | چہ سرو رنہ گردن تراشیدمی
بناخن نہ از تیغ، از روی خویش | من ایں مشت سوزن تراشیدمی
سر و ریش و ابرو بروت و مژہ | برسم برہمن تراشیدمی
ہر آں کو تراشید پیش از ہمہ | از و بیشتر من تراشیدمی
چو من راہیم خارج از رسم تو | کہ مو وقت رفتن تراشیدمی

منشی فیروز سنہ ۱۰۲۹ھ میں طالب سے ملا تھا، اس نے ملاقات کے جو واقعات لکھے ہیں ان سے طالب کی طرز زندگی کی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، اسلئے ہم اس کا خلاصہ لکھتے ہیں،

سنہ ۱۰۲۹ھ میں جب بادشاہ فتح پور میں آیا تو مجھ کو طالب کی ملاقات کا شوق

---

[1] مولوی غلام علی آزاد نے خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ اکبر نے ہندوؤں کی طرح آتش پرستی اور ریش تراشی اختیار کر لی تھی، جہانگیر نے بھی باپ کی تقلید کی، اور اسی حیثیت سے طالب کو بھی ڈاڑھی ترشوانے کا حکم دیا، لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اکبر اور جہانگیر کسی عزیز کے مرنے کے وقت داڑھی کا صفایا کراتے تھے جس کو ہندی زبان میں بھدرا کہتے ہیں، دربار کے خوشامدی بھی اس موقع پر بادشاہ کی تقلید کرتے تھے، طالب کو بھی اسی موقع پر حکم ہوا ہوگا، ورنہ ڈاڑھی ترشوانا تو خود ایرانیوں کا عام شعار تھا، جو آج بھی تمام ایران میں جاری ہے، شیعہ لوگ ہندوستان میں بھی خشخاشی ڈاڑھی رکھتے ہیں، طالب اس سے کیوں انکار کرتا،

پیدا ہوا، تالاب کے کنارے ایک خیمہ تھا، طالب اس میں مقیم تھا، میں گیا تو دیکھا کہ گویا اعتکاف میں ہے، سامنے دیوان کے اجزا ہیں، مصافحہ و معانقہ کے بعد پوچھا کیونکر تشریف لانا ہوا، میں نے کہا آپ کے چند شعر سنے تھے، ان کو سنکر ملاقات کا شوق ہوا، پوچھا کیا شعر تھے، میں نے یہ شعر پڑھے،

ع لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ع مزۂ در جہاں نمی بینم،

جب یہ شعر پڑھا،

مردم ز رشک چند بہ بینم کہ جام مے لب بر لبش گذارد و قالب تہی کند

تو اچھل پڑا، اٹھکر گلے لگایا، میرے ذوق سخن کی نہایت تعریف کی، میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا کمربند کھول ڈالئے اور آرام سے تشریف رکھیے کہ ایک دو دن لطف سے گذریں،

عین اسی حالت میں ایک مغل آگیا، جس کے ہاتھ میں خاقانی کا دیوان تھا، اور طالب سے پڑھنا چاہتا تھا، طالب نے کہا آج معاف رکھو مدت کے بعد ایک درد آشنا ملا ہے، اس سے لطف صحبت اٹھائیں گے، لیکن مغل کب مانتا تھا، دیوان کھول کر یہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا،

در پردۂ دل آمد و من کشاں خیالش جاں شد خیال بازی در پردۂ وصالش

در مرکز مثلث بگرفتہ ربع مسکوں فریاد اوج مریخ از تیغ مہ صقالش،

طالب نے اس شعر کے معنی بیان کئے تو چونکہ علمی استعداد نہ تھی، آپ شتاب باتیں کہنی شروع کیں، مجکو بے اختیار ہنسی آگئی، طالب نے جھلا کر کہا کہ اس قسم کے اشعار کو تم لوگ ہندوستان میں درس کے قابل سمجھتے ہو، میں ایسے شعر ناخن پاسے

لکھتا ہوں، میں نے کہا شاعری اور چیز ہے اور سخن فہمی اور چیز، طالب مکدر ہو کر چپ ہو گیا، مجھ کو بھی ملال ہوا کہ ناحق میں نے اس کا دل دکھایا، اس کے خوش کرنے کو میں نے اور سلسلہ چھیڑ دیا، اور کہا کہ کل دربار میں آپ کے کس شعر پر لوگ معترض تھے، طالب نے کہا یہ شعر تھا،

عنبر افسردہ ام در پردہ دارم بوی خوش

اس پر آصف خاں نے اعتراض کیا کہ عنبر کو افسردہ نہیں کہہ سکتے، اوروں نے بھی اس کی تصدیق کی، میں نے کہا کہ خاقانی نے پتھر کو افسردہ کہا ہے، پھر عنبر نے کیا قصور کیا ہے، خاقانی کا شعر یہ ہے،

کز فیض او بہ سنگ فسردہ رسد نما

طالب نہایت خوش ہوا، اور مجھ سے کہا کہ اس شعر کو ایک پرچہ پر لکھ دیجئے،[۱]

شاعری اس امر میں طالب تمام شعرا سے ممتاز ہے کہ وہ فطرۃً شاعر تھا، یعنی جب نہایت کم سن تھا اس وقت سے شعر کہتا تھا، ایک قصیدہ جو کلیات میں موجود ہے، اس وقت کا ہے جب تقریباً اسکی عمر ۱۲-۱۳ برس کی تھی، خود اس بات پر فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے،

غیر کلکِ من نشان ندہد کسی کز آب شعر ——— دفتر اسلاف شوید کودکِ دی و پریر

یعنی میرے قلم کے سوا اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی، کہ کل کا لونڈا پچھلوں کے کارناموں پر پانی پھیر دے،

وہ نہایت جلد شعر کہہ سکتا تھا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے قلم ہاتھ میں لیا اور بے تکلف لکھتا گیا، دو تین گھنٹے میں ۵۰، ۶۰ شعروں کا قصیدہ تیار ہو گیا، قلیچ خاں ناظم لاہور کی شان

۱؎ تذکرہ شعرا از محمد علی سندیلوی ذکر طالب آملی،

یہ ۸۴ شعروں کا قصیدہ ایک رات میں لکھا چونکہ خود کہتا ہے،

منم کہ نیست چو من شاعرے ز اہلِ سخن — منم کہ نیست چو من قابلے ز اہل کلام
گواہ ایں دو سہ معنی ہمیں قصیدہ بس است — کہ یافت از سر شب تا سپیدہ دم اتمام

جہانگیر کی مدح میں اس کا ایک بڑا پرزور قصیدہ ہے، جس میں ۵۰-۶۰ شعر ہیں،

چو شہسوار مرا چشم بر شکار افتاد — بزخم تیر نگہ، صید بے شمار افتاد

یہ بھی صرف رات بھر کی کمائی ہے، چنانچہ خود کہتا ہے،

بہ خام دستیم اے شہریار خردہ مگیر — کہ یک شب ایں ہمہ نقشم بروے کار افتاد

پہلی دفعہ جہانگیر کے دربار میں ناکامی کے بعد جو قطعہ دیانت خاں کو لکھا تھا، وہ بھی بالکل قلم برداشتہ تھا، خود کہتا ہے،

ازیں قیاس نما غور کن کہ قدرت کیست — بیک دو لحظہ چنیں قطعہ ادا کردن

شاعری میں طالب کا امتیازی وصف صرف دو چیزیں ہیں، ندرتِ تشبیہ، لطفِ استعارہ، استعارات کی نزاکت اس کے دور سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن اس نے اور زیادہ لطافت اور ندرت پیدا کر دی، اس کا کلام کہیں سے اٹھا کر دیکھو، ہر جگہ نئے نئے استعارات نظر آئینگے، ان میں سے اکثر لطیف اور نازک ہیں، اور بعض بعض معما سازی اور جھوٹے طلسم ہیں،

اس موقع پر ہم اس کے چند منتخب اشعار درج کرتے ہیں، ان میں ابتدا کے چار شعر وہ ہیں جو جہانگیر نے تزک جہانگیری میں ملک الشعرائی کے خطاب دینے کے وقت انتخاباً درج کئے ہیں، باقی مرزا صائب کے انتخاب ہیں،

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

عشق در اول و آخر ہمہ وجد است و سماع — ایں شرابے ست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

دو لب خواہم یکے در مے پرستی | یکے در عذر خواہی ہاے مستی

ز غارت چمنت بر بہار منت ہاست | کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

دشنام خلق را ندہم جز دعا جواب | ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

بے نیازانہ ز ارباب کرم می گذرم | چوں سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گذرد

مرد بے برگ و نوا را سبک از جاے بگیر | کوزہ بے دستہ چو بینی بدو دستش بردار

مزہ در جہاں نمے بینم | دہر گوئی دہانِ بیمار است

نظارہ را دو جہاں جز دو چشم نیست | یک چشم باز ماندہ و یک چشم برہم است

خانہ شرع خراب است کہ ارباب صلاح | در عمارت گری گنبد دستار خودند

ما را زبانِ شکوہ ز بیداد چرخ نیست | از ما خطے بمہر خموشی گرفتہ اند

دریں انجمن غیر بہاے یار | دوے را بیک فتنہ کم دیدہ ام

باصد کرشمہ آں بتِ بدمست می رود | خود می کند خرام و خود از دست می رود

میرزا صائب اصفہانی

ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہوگئی، رودکی سے پہلے بھی شعرا گذرے ہیں، اور میرزا صائب کے بعد بھی لوگوں نے طبع آزمائیاں کیں، لیکن یہ دونوں دور شمار کے قابل نہیں، اخیر دور میں قاآنی بے شبہ ایسا شخص پیدا ہوا جس نے دفعۃً شاعری کی کایا پلٹ کردی، لیکن اسکی شاعری، کوئی نئی شاعری نہیں بلکہ اس نے سات سو برس کے بھولے ہوئے خواب کو یاد دلایا، اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ فرخی اور منوچہری نے قاآنی کا قالب اختیار کرلیا،

شاعری ابتدا سے جس انداز پر چلی آتی تھی، اکبری اور صفوی دور نے دفعۃً اس کی روش بدل دی، عرفی، نظیری، وحشی یزدی، شفائی نے ہزاروں گوناگوں خیالات پیدا کرکے شاعری کے میدان کو نہایت وسیع کردیا، بالخصوص عشق و عاشقی کے رموز و اسرار اور فلسفۂ زندگی کے ایسے سیکڑوں ہزاروں نکتے بیان کئے، جو قدما کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے، لیکن یہ جو کچھ تھا اکبر و عباس صفوی کا فیض تھا، جہانگیر و شاہجہاں نے شاہانہ فیاضیاں اکبر سے بھی زیادہ دکھائیں، لیکن تمام پرزور قوتیں کام میں آچکی تھیں، جہانگیر اور شاہجہاں کے لئے فطرت کی فیاضی کا بہت کم سرمایہ رہ گیا تھا، اس عہد میں بھی جو کچھ ہوا وہ اکبر ہی کی تحریک داد وہ قوت تھی، قدسی، طالب آملی، طالب کلیم گو جہانگیری و شاہجہانی شعرا ہیں لیکن یہ بھی اکبر ہی کے نہالِ فیض کے برگ و بار ہیں،

میرزا صائب بھی اسی عہد کے یادگار ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کلیم کے سوا اس دور میں کوئی شخص اُس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور اس کے بعد تو عالمگیر کے زہد خشک نے شاعری کا چراغ ہی گل کر دیا،

صائب ایک معزز خاندان کا آدمی تھا، اس کا باپ مشہور تاجر تھا، اسکی ولادت تبریز میں[1] ہوئی لیکن نشو و نما اور تعلیم و تربیت اصفہان میں حاصل کی، اسی بنا پر اس کو تبریزی اور اصفہانی دونوں کہتے ہیں، شعر و شاعری سے اس کو قدرتی مناسبت تھی، آغاز سن شعور میں جب اسکی شاعری کے چرچے ہونے لگے تو ایک شخص نے امتحان کے طور پر ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے، مصرع یہ تھا،

شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

صائب نے پیش مصرع کہہ کر مصرع کو بامعنی کر دیا[2]،

امشب از ساقی زبس گرم ست محفل میتواں شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

یعنی آج محفل ایسی گرم ہے کہ اگر شمع بجھ جائے تو بوتل سے آگ روشن کر لیجا سکتی ہے،

باوجود شاعری کے صائب پر مذہبی خیالات بہت غالب تھے، آغاز شباب میں حرمین کا سفر کیا، واپسی کے بعد مشہد مبارک کی زیارت کی، اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ تھا،

للہ الحمد کہ بعد از سفر حج صائب عہد خود تازہ بسلطان خراسان کردم

صائب نے شاعری کی باقاعدہ تعلیم حکیم رکنا مسیح کاشی، اور حکیم شفائی سے حاصل کی،

---

[1] آتشکدہ میں لکھا ہے کہ اس کے خاندان کو عباس صفوی نے اصفہان میں لیجا کر آباد کرایا تھا، اور صائب یہیں پیدا ہوا [2] ید بیضا،

حکیم رکنا مشہور شاعر گذرا ہے، شاہ عباس صفوی اس کے گھر پر اس سے ملنے آتا تھا، شاہ عباس کو حاسدوں نے اس کی طرف سے رنجیدہ کر دیا، تو حکیم رکنا نے دربار سے قطع تعلق کیا، اور یہ مطلع لکھا،

گر فلک یک صبحدم با من گراں باشد سرش شام بیروں میروم چوں آفتاب از کشورش

اس کے بعد ہندوستان چلا آیا اور اکبر و جہانگیر کے دربار میں رسائی پائی، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو قطعۂ تاریخ لکھ کر بارہ ہزار روپیے صلے میں حاصل کیے، سنہ ۱۰۴۰ھ میں مشہد مقدس کی زیارت کی اجازت لی، شاہجہاں نے زاد سفر کے لئے پانچہزار روپیے عنایت کیے، سنہ ۱۰۶۶ھ میں انتقال کیا،

ہندوستان کی فیاضیوں کے غلغلہ سے تمام ایران گونج رہا تھا، صائب کے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی، چنانچہ خود کہتا ہے،

ہمچو عزم سفر ہند، کہ در ہر دل ہست رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

زاد سفر کے لئے اگرچہ شاعری سے بہتر کوئی چیز نہ تھی لیکن صائب چونکہ ایک معزز تاجر کے گھر میں پیدا ہوا تھا، اس نے یہ مبتذل طریقہ پسند نہ کیا، اور تجارت کے ذریعہ سے دلّی میں آیا، شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ہزاری منصب اور مستعد خاں خطاب عطا ہوا، یہیں ظفر خاں سے ملاقات ہوئی، اور اس قدر تعلقات بڑھے کہ صائب اور ظفر خاں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے[۱]،

ظفر خاں مشہور اُمرائے تیموری میں سے ہے، اس کا باپ خواجہ ابو الحسن اکبر کے

[۱] صائب کے سفر ہندوستان کے متعلق نہایت مختلف و متناقض روایتیں ہیں، میں نے سرو آزاد، ید بیضا، ریاض الشعرا کو چھوڑ کر مرأۃ الخیال کی روایت اسلئے اختیار کی ہے، کہ اس کا مصنف صائب کا گویا ہمعصر تھا،

زمانے میں ایران سے آکر دکن کا دیوان مقرر ہوا تھا، جہانگیر نے اپنے زمانے میں وزیر اعظم مقرر کیا، ۱۰۳۳ھ میں وزارت کے ساتھ کابل کی حکومت بھی عطا کی، لیکن چونکہ وزارت کے تعلق سے پایۂ تخت سے جدا نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بیٹے ظفر خاں کو باپ کی قائم مقامی کے طور پر کابل کی حکومت ملی، ظفر خاں نہایت فیاض اور قدردانِ علم و فن تھا، خود بھی شعر کہتا تھا، اور احسن تخلص کرتا تھا، مرزا صائب کی شاگردی نے اس کی استعداد کو اور ترقی دی، چنانچہ خود کہتا ہے:

طرز یاران پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست — تازہ گوئیہای او، از فیض طبع صائب است

مرزا صائب نے ظفر خاں کی مدح میں متعدد قصائد لکھے، اور چونکہ ممدوح درحقیقت مدح وثنا کا سزاوار تھا، میرزا کو اس کی مداحی پر ناز تھا، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

کلاہ گوشہ بہ خورشید و ماہ می‌شکنم — بہ ایں غرور کہ مدحت گر ظفر خانم
ز نو بہار سخایش چو قطرہ ریزہ شوم — قسم خورد بسر کلک ابر نیسانم
بلند بخت نہالا بہار تربیتا — کہ از نسیم ہوا داریت گلستانم
حقوق تربیتت را، کہ در ترقی باد — زبان کجاست؟ کہ در حضرتت فرو خوانم
تو پایۂ تخت سخن را بدست من دادی — تو تاج مدح نہادی، بفرق دیوانم
ز روے گرم تو جوشید خون معنی من — کشید جذب تو ایں لعل، از رگ کانم
تو جان ز غل بجا مصرع مرا دادی — تو در فصاحت، دادی خطاب سحبانم
ز وقت تو بمعنی شدم چناں باریک — کہ می‌توان بدل مور، کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود — نداشت طرۂ شیرازہ روے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراق بادبردۂ من — وگرنہ خارنے ماند از گلستانم

۱؎ ید بیضا و سرو آزاد بلگرامی،

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صائب نے اپنے دیوان کو ظفر خاں کی فرمایش سے مرتب کیا تھا، ان اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظفر خاں میرزا صائب کے کلام پر استادانہ نکتہ چینیاں کرتا تھا، اور اس قسم کی روک ٹوک سے میرزا کا کلام اور زیادہ ترقی کرتا جاتا تھا،

سنہ ۱۰۳۹ ہجری میں شاہجہاں نے دکن کا رخ کیا، ظفر خاں بھی اس سفر میں ہمرکاب تھا، اور میرزا صائب اس کے ساتھ تھا، جب برہان پور میں پہنچا تو چونکہ یہاں کی زمین نہایت غبار انگیز تھی میرزا صائب نے کہا،

تو یتا سازد غبار آگرہ و لاہور را　　چشم من تا خاکمال گرد برہانپور خورد

صائب کے باپ کو صائب سے نہایت محبت تھی، اس زمانے میں ہندوستان کا سفر ایک معمولی بات تھی، اور ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، تاہم محبت کا یہ جوش تھا کہ میرزا کے باپ نے ستر برس کی عمر میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور پیارے بیٹے کو ساتھ لیجانا چاہا، میرزا صائب کو مجبوراً ظفر خاں سے رخصت کی استدعا کرنی پڑی، ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس میں اس طرح اظہار مطلب کیا،

شش سال بیش رفت کہ از اصفہاں بہند　　افتادہ است توسنِ عزم مرا گذار

آوردہ است جذبہ گستاخ شوقِ من　　از اصفہاں بہ آگرہ و لاہورش اشکبار

ہفتاد سالہ، والد پیرست بندہ را　　کز تربیت بود بمنش حقِ بے شمار

زاں پیشتر کز آگرہ بہ معمورۂ دکن　　آید عناں گسستہ تر، از سیلِ بے قرار

این راہ دور را ز سرِ شوق طے کند　　با قامتِ خمیدہ، و با پیکرِ نزار

دارم امید رخصتے، از آستانِ تو　　اے آستانت، کعبۂ امیدِ روزگار

مقصود اوز آمدنش بُردنِ من ست　　لب را بحرفِ رخصتِ من کن گہر نثار

با جبہۂ کشادہ تر از آفتاب صبح — دستِ دعا بہ بدرقۂ راہ من برآر

حسن اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں یعنی سنہ ۱۰۴۱ ہجری میں شاہجہاں نے دکن سے آگرہ کا قصد کیا اور آغاز سنہ ۱۰۴۲ھ میں ظفر خاں کشمیر کی صوبہ داری پر ممتاز ہوا، میرزا صائب ظفر خاں[1] کے ساتھ کشمیر میں آیا اور اس بہشت بریں کی سیر کرکے باپ کے ساتھ وطن کو واپس گیا، ایران میں ایسے جوہر قابل کے لئے قدردانی کی کیا کمی تھی، سلاطین صفویہ نے بڑی عزت و احترام سے لیا، میرزا نے بھی ان کی مدح میں پر زور قصائد لکھے، شاہ عباس ثانی نے اسکو ملک الشعراء کا خطاب دیا، لیکن جب اس کے بعد سلیمان صفوی تخت نشین ہوا، اور میرزا صائب نے قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کا یہ مطلع تھا،

احاطہ کرد خط آں آفتاب تاباں را — گرفت خیل پری، در میان سلیماں را

تو سلیمان صفوی چونکہ نوخیز اور نوخط تھا، نہایت رنجیدہ ہوا، اور پھر تمام عمر میرزا سے خطاب نہ کیا[2]،

میرزا نے اگرچہ اخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہیں نکالا تاہم ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں، جب نواب جعفر خاں آغاز عہد عالمگیری میں وزیر اعظم مقرر ہوا تو میرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دوستاں را باحسان یاد کردن ہمت است — ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

جعفر خاں نے پانچ ہزار روپیہ اور بقول بعض پانچ ہزار اشرفیاں بھیجیں[3]،

سنہ ۱۰۸۱ ہجری میں بمقام اصفہان وفات پائی "صائب وفات یافت،" مادہ تاریخ ہے، میرزا کا ایک مطلع ہے،

[1] سرو آزاد [2] ریاض الشعراء [3] خزانہ عامرہ،

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو
عالم پُرست از تو وخالی ست جائے تو

میرزا نے وصیت کی تھی کہ یہ مطلع اس کے مزار پر کندہ کیا جائے، چنانچہ سنگ مرمر کے لوح پر کندہ کیا گیا،

عام حالات وعادات | مرزا نہایت خوددار، پابند وضع، پاکیزہ خو اور منکسر المزاج تھا، شعرائے ایران کی عام عادت ہے کہ ہندوستانی شعرا کو مطلق خاطر میں نہیں لاتے، امیر خسرو اور حسن کے سوا کسی ایرانی مستند شاعر نے کبھی کسی ہندوستانی شاعر کا نام نہیں لیا، لیکن مرزا صائب اپنے ہمعصر ہندوستانیوں کا نام بھی، غزل کے مقطعوں میں لاتا ہے، اور ان کی غزلوں پر غزل لکھنا گوارا کرتا ہے، ایک غزل غنی کے جواب میں لکھی ہے، اس کا مقطع یہ ہے،

ایں جواب آں غزل صائب کہ میگوید غنی
یادِ ایامیکہ دیگِ شوق ما سرپوش داشت

میرزا کی عادت ہے کہ اکثر شعرا کی غزلوں پر غزل لکھتا ہے اور مقطع میں ان شعرا کی غزلوں کے پورے مصرع نقل کر دیتا ہے، اس سے اس کی صحتِ مذاق اور خوبیِ انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے،

ایں آں غزل کہ فیضیِ شیریں کلام گفت
"در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ"

ایں جواب آں غزل صائب کہ می گوید ملک
"چشم بنشیں باز کن، تا ہرچہ خواہی بنگری"

بطرز تازہ قسم یاد می کنم صائب
کہ جائے طالب آمل در اصفہاں پیداست

ایں جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد
"سایۂ ابر بہاری کشت را سیراب کرد"

ایں آں غزل کہ واحدی خوش کلام گفت
"اے روشن از رخ تو زمین و زماں ہمہ"

جواب آں غزل ست اینکہ میر شوقی گفت
"چو شعر از دو طرف می کشند زنجیرم"

ایں جواب آں غزلِ صائب کہ فتحی گفتہ است
"از فراموشاں مباد، آنکس کہ ما را یاد کرد"

صائبؔ ایں تازہ غزل آں غزل شاپورؔ ست — "کہ گراں می رود آں کس کہ توکل دارد"

جواب آں غزل ست اینکہ گفتہ است مطیعؔ — "کلیدِ کعبہ و بُت خانہ در بغل دارم"

ایں جواب مصرعِ اوجیؔ کہ وقتی گفتہ است — "بادشاہی عالمِ طفلی ست یا دیوانگی"

ایں جواب آں غزل صائبؔ کہ او ہم گفتہ است — "گر نمش دامن نگیرم خون من خود مردہ نیست"

جواب آں غزل حاذقؔ ست ایں صائبؔ — "بہار دیدہ ام و گل دیدم و خزاں دیدم"

ایں جواب آں غزل صائبؔ کہ راقمؔ گفتہ است — "تیغ دائم آب در جو دارد و خوں می خورد"

شعرا میں ہمیشہ باہم رقابت اور حسد ہوتی ہے، لیکن مرزا صائبؔ اس کو نہایت ناپسند کرتا تھا، چنانچہ ایک نظم میں باہمی محبت اور اعانت کی ترغیب دی ہے،[1]

خوش آں گروہ کہ مستِ بیانِ یکدگر اند — ز جوشِ فکر مے ارغوانِ یکدگر اند

نمی زنند بسنگ شکست گوہرِ ہم — پے رواجِ متاعِ دکانِ یکدگر اند

زنند بر سرِ ہم، گل ز مصرعِ رنگیں — ز فکرِ تازہ، گلِ بوستانِ یکدگر اند

سخن تراش چو گردند، تیغ الماسند — زند چو طبع بلندی، فسانِ یکدگر اند

بغیر صائبؔ و معصومؔ نکتہ سنج و کلیمؔ — دگر کہ ز اہلِ سخن مہربانِ یکدگر اند

صائبؔ اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہمعصروں تک کو ادب سے یاد کرتا تھا، لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتقد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظؔ کا معترف تھا، اور یہ اسکی صحیح المذاقی کی بہت بڑی دلیل ہے، لوگوں کے اصرار سے ایک غزل خواجہ حافظؔ کی غزل پر لکھی ہے مقطع میں یہ عذر کیا

صائبؔ چہ تواں کرد بہ تکلیفِ عزیزاں — ورنہ طرفِ خواجہ شدن بے بصری بود

ایک اور غزل میں کہتا ہے،

---

[1] سرو آزاد، ذکر معصوم شاعر،

رواست صائب اگر نیست از رہِ دعوی　　تتبع غزلِ خواجہ گرچہ بے ادبی ست

حکیم رکنا اور شفائی کا شاگرد تھا، اس لئے ان دونوں کا نام نہایت ادب سے لیتا ہے،

ایں آں غزل حضرت رکنا ست کہ فرمود　　"پائے ملخے پیشِ سلیماں چہ نماید"

در اصفہاں کہ بدرِ سخن رسد صائب!　　کنوں کہ نبض شناسِ سخن شفائی نیست

نظیری کو عرفی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

صائب چہ خیال ست شنوی ہیچ نظیری　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہاں تک مضائقہ نہیں، لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرتِ عام کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے،

صائب نداشتیم سر برگ ایں غزل　　ایں فیض از کلامِ ظہوری بما رسید

خوشا کسی کہ چو صائب صاحبِ کمال　　تتبعِ غزلِ میرزا جلال کند

بدنداقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کر دی، اور نوبت یہ پہنچی کہ آج لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری وغیرہ کے کلام پر سر دھنتے ہیں، "بنیاد ظلم در جہاں اندک بود، ہر کہ آمد بر اں مزید کرد،

میرزا صائب نے ہر قسم کی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، قصائد متعدد ہیں، ایک چھوٹی سی رزمیہ مثنوی بھی ہے، اور غزل تو اس کا خاص فن ہے، لیکن قصائد اور مثنویاں کم رتبہ ہیں، یہ دونوں چیزیں اس دور سے پہلے ابتر ہو چکی تھیں، اور مرزا بھی اس کی کچھ تلافی نہ کر سکا، رزمیہ مثنوی کا ایک شعر یاد رکھنے کے قابل ہے،

چناں لرزہ در دشت کیں اوفتاد　　کہ قارون بروں از زمیں اوفتاد

میرزا نہایت پرگو، اور بدیہہ گو تھا، جس زمانے میں وہ برہان پور دکن میں تھا، ایک قصیدہ

ساٹھ شعروں کا صرف دو پہر میں لکھا، اس قادر الکلامی کے نشہ میں خود کہتا ہے،

ہزار حیف کہ عرفی و نوعی و سنجر — نیند جمع بدار العیار برہان پور
کہ قوتِ سخن و لطفِ طبع می دیدند — نمی شدند بطبع بلند خود مغرور
ہمیں قصیدہ کہ یک چاشت روے اودمرا — ز اہلِ نظم کہ گفت ست؟ درسنین و شہور

ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد نے ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے، مصرع یہ تھا، ع

از شیشۂ بے مے مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن

ایک دفعہ راہ میں چلا جا رہا تھا، ایک کتے کو بیٹھا ہوا دیکھا، چونکہ کتا جب بیٹھتا ہے تو گردن اونچی کرکے بیٹھتا ہے، فوراً یہ مضمون خیال میں آیا،[1]

شود ز گوشہ نشینی فزوں رعونتِ نفس — سگ نشستہ ز استادہ سرفراز ترست

فغانی کا مشہور مطلع ہے

بہ بوئیت صبحدم، نالاں بگلگشتِ چمن رفتم — نہادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

میرزا نے اس کو یوں بدل دیا،[2]

ببوئیت صبحدم گریاں چو شبنم در چمن رفتم — نہادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

شبنم کی تشبیہ نے شعر میں جان ڈال دی اور دعوے کو پورا ثابت کر دیا،

میرزا خاضع، میرزا صائب کے شاگرد اور سید عبد الجلیل بلگرامی کے ہمنشین تھے

---

[1] کلمات الشعراء سرخوش، [2] ایضاً

ان کی زبانی منقول ہے کہ ایک دفعہ میں نے میرزا صائب کے سامنے یہ مصرع پڑھا، ع

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

مصرع بالکل مہمل تھا، یعنی چند چیزیں بے مناسبت جمع کر دی تھیں، میرزا نے پیش مصرع لگا کر عجیب فلسفیانہ مضمون پیدا کر دیا،

بقدر ہر سکون راحت بود، بنگر تفاوت را دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

میرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حسن قبول حاصل ہو چکا تھا، کہ سلاطین اور امرا شاہ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے تھے اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھیجی جاتی تھیں[1]،

میرزا نے فن سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا، کہ قدما اور متاخرین کا کلام انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو سخندانوں کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہے، میرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے، لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صحیح تھا، اس لئے بلند اور نادر اشعار انتخاب کئے ہیں، شعرائے عرب میں ابو تمام ایک مشہور شاعر گذرا ہے جو متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک مجموعہ انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے، اور فن ادب کی جان ہے، اہل فن کا بیان ہے کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے، خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا،

میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہ یہی حال ہے، جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے ہیں، وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے،

میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ حیدرآباد میں دیکھا تھا، جو خود میرزا کے ایک شوقین

---

[1] ید بیضا، [2] کلمات الشعرا سرخوش،

شاگردنے ایران میں نہایت اہتمام سے طیار کرایا تھا، ہر شاعر کے نام کے ساتھ اس کے اشعار کی تعداد بھی ہندسوں میں لکھدی ہے، اخیر میں مختصر سی عبارت ہے، جس میں انتخاب کا حال لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ فن اس بیاض کی نقلیں لیتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، والہ داغستانی نے ریاض الشعرا میں جا بجا اس کے حوالے دئے ہیں، میں نے اس بیاض کے تین نسخے دیکھے ہیں، جن میں سے ایک خود میرے کتب خانے میں موجود ہے،

میرزا کے لطائف و ظرائف بہت مشہور ہیں، جس زمانے میں وہ کشمیر میں تھا، ایک دن ظفرخاں کے دربار میں اشعار پڑھ رہا تھا، اور ہر طرف سے تحسین وآفریں کی صدا بلند تھی، ایک نوخیز نے حسد سے کہا کہ یہ تمام مضامین قدما کے یہاں بندھ چکے ہیں، موجودہ شاعروں کا یہ کام رہ گیا ہے کہ صرف لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں، صائب نے برجستہ کہا،

اہلِ دانش، جملہ مضموں ہائے رنگیں بستہ اند   ہست مضموں نہ بستہ ... ... شما

چونکہ اتفاقاً شعر حسب حال تھا، ظفرخاں بے اختیار ہنس پڑا اور میرزا کو انعام دیا، میرزا نے ایک غزل لکھی تھی، جس کا مطلع تھا،

سروِ من طرحِ نوا نداختۂ یعنی چہ   جامہ را فاختۂ ساختۂ یعنی چہ

ایک مولوی صاحب نے سنا تو فرمایا کہ ردیف غلط ہے یعنی چہ غائب کا صیغہ ہے اور مخاطب کے لئے استعمال کیا گیا ہے، میرزا کے سامنے کسی نے تذکرہ کیا، اس نے کہا، شعر مرا بمدرسہ کہ برد،

ایک صاحب محمد مراد متخلص بہ لائق جون پور کے رہنے والے تھے، عالمگیر کے زمانے میں لاہور کی سوانح نگاری پر مامور تھے، آغاز شباب میں ان کو شاعری

کا شوق پیدا ہوا، میرزا صائب کی شہرت سن کر ایران کا قصد کیا، اور جوشِ اعتقاد میں جون پور سے اصفہان تک پا پیادہ گئے، میرزا نے بھی ان کے خلوص و ارادت کی بڑی قدر کی، خود اپنے گھر میں مہمان اتارا اور ہر طرح کی مہمان نوازی کی، ان کا بیان ہے کہ میں نے کبھی مرزا کو شعر کے لئے غور و فکر کرتے نہیں دیکھا، لیکن ایک دن خلافِ عادت باغ کی روشوں پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے، میں نے سبب پوچھا فرمایا کہ فردوسی کا مشہور شعر ہے،

بفرمود تا رخش را زیں کنند　　　　دُرم اندر دم نامے زریں کنند

شفائی نے اس شعر کا جواب لکھا ہے،

بفرمود تا زیں بر ابرش نہند　　　　چہ زیں ہیمہ بالائے آتش نہند

میں بھی اس کا جواب لکھنا چاہتا ہوں، انھوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں اس کام کو انجام دوں، تمام رات کی غور و فکر کے بعد صبح کو یہ شعر لکھ کر میرزا کی خدمت میں پیش کیا،[۱]

بفرمود تا زیں بر آدہمؔ نہند　　　　بہ پشتِ صبا، مسندِ جم نہند

میرزا نے بہت تعریف کی، یہ واقعہ غلام علی آزاد نے ید بیضا میں خود لائق جونپوری کی زبان سے نقل کیا ہے، لیکن قیاس میں نہیں آتا کہ صائب شفائی کے شعر کو فردوسی کے مقابلہ میں لائے، اور پھر خود جواب لکھنے کا ارادہ کرے،

کلام پر رائے

میرزا صائب کا خاص انداز تمثیل ہے، تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا لیکن صائب نے اس کثرت سے اس کو برتا کہ اس کی خاص چیز ہوگئی، اس کے علاوہ اور شعراء عام مضامین میں تمثیل سے کام لیتے تھے، صائب نے اخلاقی مضامین کے لئے خاص کر دیا،

۱؎ ید بیضا،

جا بجا خیال بندی اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی تھی، اور یہ خاص متاخرین کا انداز ہے، اگرچہ صائب کے ہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار نہیں پائے جاتے جو عرفی و نظیری کے ہاں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، تاہم زبان کی فصاحت ترکیب کی بندش، محاورات کا استعمال، ہاتھ سے نہیں جانے پاتا، بخلاف اور متاخرین کے جن کے کلام کو پڑھ کر زبان کی خوبیوں کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہیں ہوتا،

اشعار ذیل ملاحظہ ہوں،

خود مگر از در انصاف درآئی ورنہ — جذبۂ شوق حریفِ دلِ خود کامِ تو نیست

قمریاں پاس غلط کردہ خودی دارند — ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندامِ تو نیست

یعنی قمریوں کو اپنی غلط بات کی پچ آن پڑی ہے، ورنہ ایک سرو بھی تیرے قد و قامت کا ہمسر نہیں،

شب کہ صحبت بحدیث سر زلف تو گذشت — ہر کہ برخاست ز جا سلسلہ برپا برخاست

یادگار جگر سوختۂ مجنون ست — لالۂ چند کہ از دامنِ صحرا برخاست

نہ شبنم ست چمن را بروے آتشناک — عرق ز روے تو کردہ است گل بدامن پاک

تو فکر نامۂ خود کن کہ مے پرستاں را — سیاہ نامہ نخواہد گذاشت گریۂ تاک

دلم بپاکیِ دامان غنچہ می لرزد — کہ بلبلاں، ہمہ مستند و باغباں تنہا

چشم عاشق ز تماشاے تو چوں سیر شود — ہر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہِ دگرست

کہ گذشت ست ازیں بادیہ دیگر کامروز — نبض رہ می طپد و سینۂ صحرا گرم ست

طوفانِ گل و جوش بہارش بہ بینید — اکنوں کہ جہاں برسر کارست بہ بینید

عالم بخبری طرفہ بہشتے بودہ است — حیف صد حیف کہ ما دیر خبر دار شدیم

ہم ایں جا صلح کن با ما چہ لازم — کہ در محشر ز ما شرمندہ باشی

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی ۔ کشادہ روے تراز راز ہاے مستاں باش

تمیزِ نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست ۔ چو چشمِ آئینہ در خوب و زشت حیراں باش

درونِ خانۂ خود ہر گدا شہنشاہ است ۔ قدم بروں منہ از حدِ خویش سلطاں باش

میانِ نور و ظلمت عالمے دارم نمے دانم ۔ کہ شامم صبح یا صبحِ امیدم شام می گردد

ایں قدر کز تو دے چند شود شاد بس ست ۔ زندگانی بمرادِ ہمہ کس نتواں کرد

صائب کے تمثیلیہ اشعار چونکہ عام طور پر زبانوں پر ہیں، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں،

ابو طالب کلیم

ملک الشعرائے شاہجہانی

یہ یگانۂ فن صحیفۂ شاعری کا آخری ورق ہے اور اسی کے نام پر (شعر العجم حصۂ سوم) کا خاتمہ ہے

ہمدان میں پیدا ہوا، لیکن کاشان میں زیادہ کام رہا، آغاز جوانی میں شیراز جا کر علوم درسیہ کی تحصیل کی[1]،

جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، امرائے جہانگیری میں شاہنواز خاں صفوی ابن مرزا رستم صفوی ایک مشہور امیر تھا، عالمگیر اور مرزا شجاع اس کے داماد تھے، کلیم نے اول اس کے دربار میں رسائی پیدا کی، لیکن ۱۰۲۸ھ ہجری میں وطن کی یاد نے بے چین کیا، اس زمانے کا ہندوستان وہ چیز تھی کہ کلیم گو وطن کو جاتا تھا، لیکن حسرتوں کا انبار لئے جاتا تھا، اسی حالت میں غزل لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں[2]،

ز شوقِ ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم ۔۔۔ کہ رو ہم گر براہ آرم نے بینم مقابل را

ہندوستان کے شوق میں میری آنکھیں اس طرح پشت کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ سامنے کے رخ پر نظر بھی ڈالتا ہوں تو سامنے کا آدمی نظر نہیں آتا،

اسیرِ ہندم و زیں رفتنِ بیجا پشیمانم ۔۔۔ کجا خواہد رساندن، پر فشانی مرغ بسمل را

بہ ایراں میرود نالاں کلیم از شوقِ ہمراہاں ۔۔۔ بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

---

[1] شاہجہاں نامہ جلد ثانی صفحہ ۳۵۳ [2] خزانۂ عامرہ و شعر آزاد،

اس حالت کے ساتھ وطن میں کیا جی لگتا، دو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ پھر ہندوستان واپس آیا، اب کی اس نے میر جملہ شہرستانی کا دامن پکڑا، میر جملہ کو جہانگیر نے دست خاص سے خط لکھ کر اصفہان سے بلایا تھا چنانچہ ۱۰۲۷ھ ہجری میں باریاب ہوا اور دو و نیم ہزاری کا منصب ملا، شاہجہاں کے زمانے میں پنجہزاری تک پہنچا کلیم کی شاعری کا اگرچہ سکہ جمتا جاتا تھا، اس کے سرپرست بھی دربار شاہی میں خاص اعزاز رکھتے تھے، لیکن جہانگیر تک اس کی رسائی نہ ہو سکی، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا، اور اس کے سامنے کلیم کا فروغ پانا ممکن نہ تھا، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جس سال یعنی ۱۰۲۸ھ میں طالب آملی کو ملک الشعرائی کا خطاب ملا ہے، اسی سال کلیم ایران کو واپس گیا ہے[1]، اس سے بدگمان طبیعتیں نتیجہ نکال سکتی ہیں کہ کلیم کو رشک نے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا،

کلیم کی ناکامیابی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ نورجہاں بیگم اسکی شاعری کی معتقد نہ تھی اور اکثر اس کے اشعار پر حرف گیری کیا کرتی تھی، ایک دفعہ کلیم نے ایک شعر کہا اور خوب دیکھ لیا کہ کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں، شعر یہ تھا،

زشرم آب شدم کاب را شکستی نیست   بحیرتم کہ مرا روزگار چوں شکست

میں شرم سے پانی ہوگیا، حیرت ہے کہ زمانہ مجھ کو کیوں کر توڑ سکا، پانی تو ٹوٹنے کی چیز نہیں

کلیم نے یہ شعر نورجہاں بیگم کے پاس بھیجا، نورجہاں فوراً بول اٹھی کہ "یخ بست و پس شکست" یعنی پانی کو پہلے یخ بنادیا پھر توڑا[2]،

معلوم ہوتا ہے کہ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جا بجا خاک چھانی، شاہجہاں نامہ

---

[1] خزانہ عامرہ [2] سرو آزاد تذکرہ طالب آملی [3] مراۃ الخیال، بعض تذکروں میں یہ واقعہ طالب آملی کی طرف منسوب ہے،

میں لکھا ہے کہ وہ دکن میں مارا مارا پھرا، اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا ایک قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں بھی ہے، ایک اور قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ میں جاسوسی کے شبہہ میں پکڑا گیا اور قلعۂ شاہدرک میں قید رکھا گیا،

چنانچہ کہتا ہے،

فلک قدرا بانے پرسی کہ گردوں   چرا آزردہ مارا بے محابا
چرا آزردہ بیمار غمے را   کہ سے آمد بدرگاہِ مسیحا
بعزمِ سیرِ بیجاپور گشتم   رہے با اخترے چوں دشت پیما
بچنگ راہداراں اوفتادیم   چہ گویم تا چہا کردند برما
ہمہ اندر تجسس موشگافاں   ہمہ در گنج کاوے ذہن دانا
یکے گوید کہ دزدانند باشند   بزندان چند گہ زنجیر فرسا
دگر گوید کہ جاسوس فلانند   کہ از تفتیشِ ما گشتند بینا
یکے می گوید اینان را بکاوید   کہ شاید نامہ گردد ہویدا
زبس تفتیش از ہم می کشودند   اگر در بار (اسباب) ما بودے معما
کنوں در چنگِ ایشاں مبتلایم   نمی دانیم چارہ جز مدارا
ز بہر (بہرہ) پاس، ہندوہاے باتیغ   چو مو استادہ وایم بر سر ما
عجب دارم کہ با ایں منع جادہ   چساں بے خواست آمد تا باینجا

یہ قصیدہ شاہ نواز خاں کے نام لکھا ہے اور اخیر میں لکھا ہے،

اشارت کن کہ چوں اقبال گردیم   بخاکِ آستانت جبہ فرسا

بہر حال رفتہ رفتہ شاہجہاں کے دربار میں رسائی ہوئی، اور ملک الشعرا کا خطاب ملا،

۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہاں نے کروڑ روپیے کی لاگت سے تخت طاؤسی تیار کرایا، اور آگرہ میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی، تو کلیم نے قصیدہ لکھا،

خجستہ مقدم نوروز و غرۂ شوال   فشاندہ اند چہ گلہائے عیش بر سر سال

شاہجہاں نے اس کے صلے میں روپیے کے برابر تلوایا، چنانچہ ۵۵۰۰ روپیے وزن میں آئے اور اس کو عطا کئے،

کلیم شاہجہاں کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کی رنگینی اور آب و ہوا کی دلآویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ وہیں کا ہو رہا، بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھ کو یہیں رہنے کی اجازت دیجئے میں یہاں بیٹھ کر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کروں گا، یہ درخواست منظور ہوئی ۱۰۵۵ھ میں جب شاہجہاں پھر کشمیر گیا تو کلیم نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر پیش کیا، اور خلعت، اور دو سو اشرفیاں انعام میں پائیں، ۱۰۶۱ھ ہجری میں وفات پائی، غنی نے سال تاریخ لکھا ع

طور معنی بود روشن از کلیم

عام حالات کلیم بخلاف اور شعراء کے نہایت صاف دل، سیر چشم، فیاض طبع تھا، معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا تھا اور گرم جوشی سے ملتا تھا، میرزا صائب اور میر معصوم (ابن میر حیدر معمائی) سے خاص محبت تھی، چنانچہ میرزا صائب نے ایک غزل میں اس کا ذکر کیا ہے[1]،

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج کلیم   دگر کہ ز اہل سخن مہربان یک گر اند

جلال اسیر کا بہت معتقد تھا، چنانچہ کہتا ہے[2]،

میرزائی ما جلال الدین بس ست   از سخن سنجان طلب گار سخن

۱؎ سرو آزاد تذکرۂ میر معصوم ۲؎ ایضاً تذکرۂ جلال اسیر،

راستی طبعش استاد من ست　　　کج نہم بر فرق دستار سخن

ملک قمی نے جب انتقال کیا تو کلیم نے قطعۂ تاریخ لکھا، جس کے چند شعر یہ ہیں،

ملکِ آں بادشاہ ملکِ معنی　　　کہ نامش سکۂ نقدِ سخن بود

چناں آفاق گیر از ملکِ معنی　　　کہ حدِ ملکش از قم تا دکن بود

بجستم سالِ تاریخش ز ایام　　　بگفتا دو سرِ اہلِ سخن بود

اکثر شعرائے ایران باوجود اس کے کہ ہندوستان میں آکر خاک سے آسمان پر پہنچے لیکن ہندوستان کو گالیاں دیتے ہیں، بخلاف ان کے کلیم ہندوستان کا مداح اور افسانہ خواں ہے، ایک قصیدہ کی پوری تمہید ہندوستان کی مدح ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے،

تواں بہشت دوم گفتنش باین معنی　　　کہ ہر کہ رفت ازیں بوستاں پشیماں شد

کلیم نہایت حاضر جواب اور مضمون یاب تھا، قیصر روم نے شاہجہاں کو خط لکھا کہ آپ صرف ہندوستان کے بادشاہ ہیں، شاہجہاں کا لقب کیوں اختیار کیا ہے؟ شاہجہاں کو بھی خیال ہوا کہ یہ غلط بیانی ہے، یمین الدولہ سے کہا کہ کوئی اور خطاب اختیار کرنا چاہئے، کلیم کو خبر ہوئی، اسی وقت قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس میں لقب کی یہ توجیہ کی[1]

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکیست　　　شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن ست

یعنی ہند اور جہاں دونوں لفظ کے عدد ایک ہیں، (۵۹) اس لئے شاہجہاں اور شاہ ہند دونوں کہہ سکتے ہیں،

خان جہاں لودی نے جس کا اصلی نام پیرا تھا، جب بغاوت کی اور شکست کھا کر

۱؎ کلمات الشعراء سرخوش، لیکن سرخوش نے دوسرا مصرع جس طرح نقل کیا ہے دیوان میں نہیں اسلئے ہم نے دیوان کے مطابق نقل کیا ہے،

مقتول ہوا تو اس کا اور اس کے شریک بغاوت دریا خاں کا سر ایک ساتھ دربار میں آیا، کلیم نے برجستہ رباعی کہی،

ایں مژدۂ فتح از پے ہم زیبا بود　　ایں کیف دوبالا چہ نشاط افزا بود
از کشتنِ دریا سرِ پیرا ہم رفت　　گویا سرِ او حبابِ ایں دریا بود

شاعری | کلیم نے شاعری کی تمام صنفوں کو لیا ہے، قصائد کثرت سے ہیں، کئی مثنویاں ہیں، غزلوں کا دیوان الگ ہے، مثنوی مدت سے اپنے پایہ سے گر چکی تھی، کلیم کی مثنویاں بھی کم رتبہ بلکہ عامیانہ ہیں، اتنی بات ہے کہ وہ نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظم لکھتا ہے، (اکثر شعرا کے نزدیک یہ بھی ابتذال میں داخل ہے) مثلاً انگوٹھی، قلمدان، کشتی، بندوق وغیرہ وغیرہ، سب کی شان میں قطعات اور رباعیاں لکھی ہیں،

ایک دفعہ گرمی دانے نکلے، اس پر ایک بڑا قطعہ لکھا، تپ آگئی، اس پر بھی نظم لکھدی،

اسی جزئی واقعہ نگاری کا اثر ہے کہ اور ایرانیوں کے برخلاف، ہندوستان کے بہت سے پیشوں، صنعتوں، پھولوں اور پھلوں کے نام لکھدئے ہیں جن کا نام بھی زبان قلم پر لانا اور شعر ارگن سمجھتے تھے، عرفی عمر بھر ہندوستان میں رہا لیکن عمر بھر میں صرف ایک ہندی لفظ جھکڑ زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح بدل کر کہ گویا فارسی ہے، طالب آملی نے رام رنگی ایک شعر میں باندھ دیا، اس کو لوگوں نے تعجب سے دیکھا، لیکن کلیم سیکڑوں ہندی الفاظ بولتا چلا جاتا ہے مثلاً

منہ بر وعدۂ تنبولیان دل　　کہ جز خون خوردن ازوی نیست حاصل

زحسنِ شستۂ دھوبی چہ گویم　　ازاں بے پردہ محبوبی چہ گویم

غرور حسن با جہل پٹھانی　　چو گردد جمع نتواں زندگانی

بتانِ راجپوت و شیخ زادہ　　شکیب عاشقاں برباد دادہ

چہ چینہ شعلۂ شمعے ست بے دود — کہ آتش می زند در خرمنِ عود
زموزونانِ نظر دریوزہ دارم — کہ وصفِ مولسری را بر نگارم
گل گڈھل نہ فہمیدست موسم — شگفتہ چوں رخِ یارست دایم
نہال نیمش از بس خوش نسیم ست — دلِ طوبیٰ ز رشکِ آں دو نیم ست

جو قابلِ ذکر واقعات اس کے زمانے میں پیش آئے، سب پر اس نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے، عالمگیر شہزادگی کے زمانے میں جب اس کی عمر ۱۴ برس کی تھی، مست ہاتھی سے لڑا تھا، جس کی کیفیت ہے کہ شاہجہاں ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا، شہزادے بھی گھوڑوں پر سوار تماشے میں مصروف تھے، عالمگیر قریب سے دیکھنے کے لئے جوشِ شجاعت میں گھوڑے کو آگے بڑھائے جاتا تھا، ایک ہاتھی حریف کو چھوڑ کر عالمگیر پر جھپکا، عالمگیر نے پیشانی کو تاک کر برچھا مارا، ہاتھی نے غصہ میں آکر گھوڑے کو دانتوں میں دبا لیا، عالمگیر زمین پر آیا، لیکن جھٹ پٹ اٹھ کر ہاتھی پر حملہ آور ہوا، اِدھر راجہ جے سنگھ نے بڑھ کر پے در پے برچھے کے وار کئے، ساتھ ہی مقابل کا ہاتھی آپہنچا، اور یہ ہاتھی بھاگ نکلا، شاہجہاں نے عالمگیر کو گود میں لے کر پیار کیا اور اشرفیوں میں تلوا کر اشرفیاں خیرات کیں[1]،

کلیم بھی اس واقعہ میں موجود تھا، چنانچہ ایک قطعہ اور ایک مثنوی میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھی، مثنوی یہ ہے،

بہ مانیِ گوش ارباب ہوش — یکے قصہ دارم بمن دار گوش
حدیثے سراسر بیانِ وقوع — بگویم بتو از زبانِ وقوع
ز مردم من ایں نقل نشنیدہ ام — من از دل شنیدم دل از دیدہ ام

---

[1] شاہجہاں نامہ، واقعات ۱۰۴۱ھ ہجری،

ابتدائی واقعات لکھ کر کہتا ہے،

دوید از قضا آں دو فیلِ مہیب   یکے سوے شہزادہ اور نگ زیب
بمردی ز جا، یک سرِ مو نہ شد   ز راہ چنیں سیل یک سو نہ شد
یکے نیزۂ برق ساں تافتہ   نظر از رگِ غیر تش باختہ
ز قدرت چناں زد بہ پیشانیش   کہ جست از قفا برقِ رخشانیش
دراں کوہ پیکر نہاں شد سناں   دگر بار در رفت آہن بہ کان
ز خرطوم انداخت پیچان کمند   فتاد اسپِ شہزادہ در پیل بند
گرفت اسپ و شہزادہ بروے سوار   ز بیم آب شد زہرۂ روزگار
چو در اسپ سامان جولاں ندید   چو شہبازے از خانۂ زیں برید
ہماں دم کہ بر خاک پا را فشرد   رواں دستِ جرأت بشمشیر برد
علم کردہ شمشیر بروے دوید   کزاں سوے فیل غنیمش رسید
دریں سن اگر بودے افراسیاب   ہمی گشت از دیدن فیل آب
در آغاز و انجام آں گیر و دار   ہمی دید شاہنشہ کامگار
ازاں شیر دل چوں بدید آں جگر   بفرقش بیفشاند گنج و گہر
نظر کردۂ شاہِ آفاق شد   بمردانگی در جہاں طاق شد.

قصائد

قصیدہ میں حاجی محمد جان قدسی کا انداز ہے، یعنی عرفی اور نظیری کی پیچدار اور مشکل بندشیں صاف کردیں اور مبالغہ اور حسنِ تعلیل کو وسعت دی، لیکن اس کے ساتھ قصیدہ کی متانت زور اور بلندی کم ہوگئی، اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا،

جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں، کلیم کے ہاں اس کی اس قدر بہتات ہے،

کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے، قصائد کی تمہید اکثر اصلی واقعات سے شروع کرتا ہے، مثلاً موسم کی گرمی اور سردی یا سفر کی سختی پہاڑوں کی دشوار گذاری، لیکن خیالی مضمون آفرینیاں کرکے ایک طلسم بنا دیتا ہے، جس کو واقعیت سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا، تاہم جستہ جستہ ان ہی میں ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں، جو شاعری کی جان ہیں مثلاً ابر و بہار

سحاب از تیر باران بہاری — بہ بستاں جملہ گلہا را نشاں کرد
بنوعے آتش گل در گرفت است — کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

—•✕•—

دگر بہار جہاں را چناں گلستاں کرد — کہ شوق سیر چمن، سرو را خراماں کرد
چو وام دار تہیدست از خجالت ابر — بزیر سبزہ، زمیں روی خویش پنہاں کرد
ز نازکی نتواں غنچہ را ز گلبن چید (مقروض) — گل حباب بیارد کسے بداماں کرد
نازکی کی وجہ سے کوئی شخص کلی کو توڑ نہیں سکتا — جس طرح حباب کا پھول دامن میں نہیں لیا جا سکتا
چراغ روز، اگرچہ بے فروغ می باشد — ببیں کہ لالہ در دشت را فروزاں کرد
یہ نہ کہو کہ دن کے چراغ میں روشنی نہیں ہوتی — دیکھو لالہ نے کس طرح صحرا کو روشن کر دیا ہے

—•—

اگر ز عالم بالا نوید رحمت نیست — بخاک ایں ہمہ باران چہ می برد پیغام
سرود محفل مستاں مگر دمے بشنود — نہادہ ابر بہر خانہ، سینہ بر لب بام
شگوفہ پیرہن تر بشاخ اگرچہ فگند — ندید پرتو خورشید را درین ایام
سردی کی شدت،
خورشید و گر نقاب دار ست — منقل، معشوق در کنار ست (انگیٹھی)

محرابِ جہانیان بخاری ست — تسبیحِ خلائق از شرار ست
(آتشدان)

چوں آئینہ بستہ شد نفسہا — دل از دمِ سرد سنگ سار ست

یخ بر سر کوچہ بندی آمد — نہ راہ پیادہ نے سوار ست

گوئی تو، کہ پنبہ اش زبرف است — پوشش بر تن اگر ہزار ست

مرغابی ہمچو نقشِ ابرے — بر کاغذِ یخ بہ یک قرار ست

ماہی در یخ میان جدول — چوں موج بہ تختۂ چنار ست

اس زمانے میں قصائد کا کمال صرف مبالغہ، تشبیہ، حسنِ تعلیل، اور مغالطۂ شعری پر محدود تھا، اور اس میں شبہہ نہیں کہ یہ اوصاف کلیم کے قصیدوں میں نہایت افراط اور نہایت وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں، اس کے یہاں ترکیبوں کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی بھی اس حد تک ہے کہ اس کے ہمعصروں میں نہیں ہے، طالب آملی سے وہ جدت، استعارات اور شوخی میں کم ہے لیکن اور اوصاف میں اُس سے بہت آگے ہے، بعض بعض قصیدوں کے مسلسل اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، جس سے اسکا اندازہ ہوگا،

در آستانِ جلالش عصاے درباں را — فلک ز سدرۂ رضواں ز شاخِ طوبیٰ داد

کفِ سخاش غلط بخش نیست ہمچو سحاب — سحاب ہرچہ بدریا فشاند بیجا داد

فراستش بخبر گیری ممالکِ رفت — چو بازگشت خبر ز آشیانِ عنقا داد

بہ تیر امرشں حکمِ نفاذ داد آں کس — کہ دلبری بکمانِ ابروانِ رعنا داد

نمود خاکِ درش را کہ توتیا این ست — خدا نخست بہر کس کہ چشمِ بینا داد

چو خسرواں کہ اسیرِ غنیم باز دہند — کفِ عطاش گہر را دگر بدریا داد

یعنی جس طرح بادشاہ، دشمن کے قیدیوں کو واپس کر دیتے ہیں ممدوح نے موتی دریا کو واپس دیئے

گردون نشاط کودکے از سرجناں گرفت — کانگشترِ کواکبش از سرتواں گرفت

آسمان اس قدر طفلانہ خوشی میں مصروف ہے کہ چاہیں تو اُس کے ہاتھ سے ستاروں کے چھلّے اتار لیں، اور اسکو خبر نہو،

از شیشہ استفاضۂ انوار می کنند — عالم تمام مذہب اشراقیاں گرفت

اکنوں ہجومِ کام بود مانعِ وصال — گل پرشد آنچناں کہ در بوستان گرفت

اب مقصد کا ہجوم ہی وصال کا مانع ہو — پھول اس قدر پھٹ پڑے ہیں کہ باغ کا دروازہ رک گیا

زیں ساں کہ روزگار جوانمرد خوش اداست — تاوانِ عمرِ رفتہ تواں از جہاں گرفت

ایں روئے تازہ کہ جہاں را نمود درو — گوئی ز گرد موکب شاہجہاں گرفت

مدحیہ مضامین ہزاروں دفعہ پامال ہو چکے ہیں، اس لئے کسی شاعر کی زور طبع اور جدت آفرینی کا اندازہ کرنا ہو تو خاص ان موقعوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کلیم اگرچہ مدح سے بچتا ہے یعنی طبیعت کا اصلی زور، بہار وغیرہ کی تمہید میں صرف کر دیتا ہے تاہم اسکی جدت آفرینیاں استعجاب کے قابل ہیں،

بعہدش آنچناں در خواب امن ست — کہ باید پاسبانے پاسباں را

اس کے زمانہ میں لوگ اس قدر چین سے پڑے سوتے ہیں کہ خود پاسبان کے لئے ایک پاسباں درکار ہے

بملکش راہ زن مانند جادہ — بمنزل می رساند کارواں را

اس کی سلطنت میں خود راہزن، راستہ کی طرح قافلہ کو منزل تک پہونچا دیتا ہے

بعہد عدلِ او واپس ستانند — چمن از خاک زر ہائے خزاں را

کفش پرداخت کانِ گوہر و زر | فلک ہر چہ آخر این و کان را
درونِ شیشہ افلاک بہ بند | بسانِ مے، فضائے آسمان را
زحرف رفعتِ شانش قلم بخود لرزد | بہ احتیاط قدم می نہند در کہسار
دلش غبار خلائق نکردہ است قبول | نگیرد آئینۂ آفتاب را زنگار
سخن بگفتن اول بہ نزد فطرت او | عجب مدار کہ معیوب گردد از تکرار
بروزگارش، ناراستی بر افتادہ است | بغیر سیل نیابی بہ دہر کج رفتار
گناہِ عالمیاں گر ہمہ صدا گردد | ز کوہ حلمش آواز نشنوی یکبار

غزل | کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے، غزل میں اس کے پیش روؤں نے خاص خاص باتیں پیدا کی تھیں، مثلاً عرفی نے فلسفہ، نظیری نے تغزل، طالب آملی نے شوخی استعارات، وحشی اور میلی نے معاملہ بندی کلیم کے ہاں گو تغزل کے سوا اور سب کچھ ہے لیکن اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، مثالیہ جو صائب کا خاص انداز ہے اسکی ابتدا بھی کلیم ہی نے کی، فلسفہ میں وہ بہت دقیق باتیں پیدا نہیں کرتا، لیکن اس عنوان پر اسنے جو کچھ لکھا ہے جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ فلسفہ ہو جائیگا غزل میں اس کے خصوصیات کو ہم الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

مضمون آفرینی اور خیال بندی | جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں اس کی تحلیل کی جائے تو وہ یا کوئی نیا استعارہ یا تشبیہ ہوتی ہے، یا کوئی انوکھا مبالغہ ہوتا ہے، یا کوئی شاعرانہ دعویٰ ہوتا ہے جو در اصل صحیح نہیں ہوتا لیکن شاعر اس کا مدعی ہوتا ہے اور شاعرانہ استدلال سے ثابت کرتا ہے اسی کو حسنِ تعلیل بھی کہتے ہیں، یہ سب باتیں کلیم کے ہاں نہایت اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں، مثلاً،

بسکہ زدیدہ ریختم خونِ دلِ خراب را　　　گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

میں نے اس قدر خون آنکھوں سے بہایا کہ میرے آنسوؤں نے آفتاب کے پنجہ میں مہندی لگا دی

می نہم در زیر پاے فکر کرسی از سپہر　　　تا بکف می آورم یک معنی برجستہ را

فکر کے پاؤں کے نیچے آسمان کی کرسی رکھ لیتا ہوں، تب ایک برجستہ مضمون ہاتھ میں آتا ہے،

سپہر دوں درِ فیض آنچناں بست است در عالم　　　کہ سیلاب بہاری تر نمی سازد لب جو را

آسمان نے فیض کا دروازہ اس طرح بند کرلیا ہے، کہ بہار کا سیلاب نہر کے لب بھی تر نہیں کر سکتا،

حدیث بحر فراموش شد کہ دور از تو　　　ز بس گریستہ ام، آب بردہ دریا را

لوگ دریا کی کہانی بھول گئے، اس لئے کہ میں اس قدر رویا کہ دریا کو پانی بہالے گیا،

شعلہ بر می خاست از بیطاقتی و می نشست　　　من نہ جنبیدم زجا تا جا بہ گلخن داشتم

شعلہ بے صبری کی وجہ سے اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، لیکن میں جب تک آگ میں رہا ذرا جنبش نہیں کی

خون دل رو بکمی کرد ز سوز تب ہجر　　　آں قدر نیست کہ یک آبلہ را آب دہد

شراب کہنہ می نوشم بہ بزم او چو بنشینم　　　بمن تا نوبت آید، دخترِ رز پیر می گردد

زاں برق حسن کآفت ہر گوشہ گیر شد　　　آتش در آشیانۂ عنقا گرفتہ است

یک رہبرم دریں شب تاریک بر نخورد　　　چوں آفتاب دست بدیوار می کشم

اس شب تاریک میں مجھکو کوئی رہنما نہیں ملا، آفتاب کی طرح میں دیوار پکڑ کر چلتا ہوں،

مثالیہ مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے، امیر خسرو کا مشہور قصیدہ، سراپا اسی صنعت میں ہے، لیکن کلیم، مرزا صائب، اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنا دیا، چونکہ یہ تینوں شاعر کشمیر میں مدت تک ساتھ ہمدم و ہم قلم رہے تھے، اور باہم مشاعرے کرتے تھے، اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولانگاہ بنا دیا، علی قلی سلیم

بھی مثالیہ میں کمال رکھتا ہی اور اسکی بھی وجہ شاید یہی ہو کہ سلیم بھی یہیں (کشمیر میں) مدفون ہی،

بہرحال کلیم نے اس صنف کو بہت ترقی دی، اس کے اکثر دعوے فی نفسہٖ صحیح ہوتے ہیں، لیکن استدلال شاعرانہ ہوتا ہے، بعض جگہ دعوی اور دلیل دونوں خیالی ہوتے ہیں، اور وہاں شاعرانہ تخیل زیادہ پائی جاتی ہے، مثلاً

جز سوز عشق نیست سراسر بیانِ ما — چو شمع، یک سخن گذرد بر زبانِ ما

مرا مسوز کہ نازت ز کبریا افتد — چو خس تمام شود شعلہ ہم ز پا افتد

مجھکو نہ جلا دو ورنہ تمھارا غرور بھی جاتا رہے گا، جب خس جل چکتا ہی تو شعلہ بھی بجھ جاتا ہے

روشن دلاں خوشامد شاہاں نگفتہ اند — آئینہ عیب پوش سکندر نمی شود

مدعی گر طرفِ ما نشود، صرفہ اوست — زشت آں بہ کہ بہ آئینہ برابر نہ شود

دشمن اگر ہمارا مقابلہ نہ کرے تو اس میں اسی کا فائدہ ہی، بدصورت کے حق میں یہی بہتر ہی کہ آئینہ کے سامنے نہ آئے،

مقبول روزگار نگشتیتم دانیم — مارا کہ برنداشتہ چوں برزمیں زند

در محفلے کہ تازہ درآئی گرفتہ[1] باش — اوّل بہ باغ غنچہ گرہ برجبیں زند

در روزگار دیدم از راستی نشاں نیست — صبحش کہ صادق آمد در شیر آب دارد

زمانہ میں سچائی کہیں نہیں پائی جاتی، صبح صادق کو، صادق کہتے ہیں، لیکن وہ بھی دودھ میں پانی ملاتا ہے، صبح کی روشنی کو دودھ سے تشبیہ دی ہے،

قطع امید کردہ، نخواہد نعیم دہر — شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

روشندلاں حباب صفت دیدہ بستہ اند — روزن چہ احتیاج، اگر خانہ تار نیست

---

[1] گرفتہ یعنی اپنے آپ کو لئے ہوئے، جس سے بظاہر رکھائی محسوس ہو،

روزگار اندر کمین بخت ماست — دزد دایم در پے خوابیدہ است

پامال حوادث، نتوانم کہ نباشم — چوں نقش قدم، خانۂ من بر سر راہ است

دارد اگر صفائے دل از شراب دارد — روشن ترست شیشہ وقتیکہ آب دارد

دل میں صفائی آتی ہے تو شراب سے آتی ہے، شیشہ میں جب پانی ہوتا ہے تو زیادہ چمکتا ہے،

صبر گوارا کند ہر چہ ترا ناخوش است — ساعتے از کف بنہ، آب گل آلود را

ناگوار چیز بھی صبر کرنے سے گوارا ہو جاتی ہے، پانی گرد آلود ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ گرد نیچے بیٹھ جائے گی،

کینہ بر وعدہ ہائے بخت نتواں دوختن — خفتہ گر در خواب حرفی گفت ازاں آگاہ نیست

دل گماں دارد کہ پوشیدہ است از عشق را — شمع را فانوس پندارد کہ پنہاں کردہ است

دل آگاہ سے باید و گر نہ — گدا یک لحظہ بے نام خدا نیست

می پذیرند بداں را بطفیل نیکاں — رشتہ را پس ندہد[1] آں کہ گہر می گیرد

چوں خس و خاشاک سیلاب ایمنیم از گمرہی — پا بدوش راہبر، دایم بمنزل میروم

ہمکو سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح گمرہی کا ڈر نہیں، اسلئے کہ ہم خود رہنما کے کندھوں پر سوار ہو کر سفر کرتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ خس و خاشاک کا رہنما سیلاب ہی ہے اور خس و خاشاک سیلاب ہی کے کاندھے پر سوار ہیں،

نام و نشاں ز عشق بغیر از ہوس نماند — از سیل رفتہ خار و خسے یادگار ماند

از خاک بر گرفتہ دوراں[2] چو نے سوار — دایم پیادہ رفت اگرچہ سوار شد

از ہنر، حال خرابم نشد اصلاح پذیر — ہمچو ویرانہ کہ از گنج خود آباد نشد

ہنر اور علم نے میری حالت کی اصلاح نہ کی جس طرح ویرانہ کہ خزانے نے اس کو آباد نہ کیا،

---

[1] پس دادن، واپس دینا، [2] یعنی جس کو زمانہ نے بلند کیا ہو،

اقلیم بروز مسخّر نمی شود
این فتح بے شکست میسر نمی شود

چرخ از بہر تو در کار بود حرص تو چیست
آسیا از پے رزق دگران برگردد

سفلہ از قرب بزرگان نکند کسب شرف
رشتہ پر قیمت از آمیزش گوہر نشود

دست ہر کس را بسان سبحہ بوسیدم چہ سود
ہیچ کس نکشود آخر عقدۂ کار مرا

با من آمیزش او الفت موج ست و کنار
دمبدم با من و پیوستہ گریزاں از من

چو ہست قدرت دست دل تونگر نیست
صدف گشادہ کف است آں زماں کہ گوہر نیست

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست
رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت
(مڑ کر نہ دیکھا)

بجزم احتیاجے نیست گر این است گمراہی
کہ کوراں را عصا ہم می تواند راہبر باشد

نہ ہر کہ صدر نشیں شد عزیز شد کہ غبار
اگر بدیدہ رسد توتیا نخواہد شد

واصل[1] ز حرف چون و چرا بستہ است لب
چوں رہ تمام گشت جرس بے زباں شود

شیطان چہ متمتع برد از اہل تجرد
رہزن چہ دریں بادیہ از ریگ رواں یافت

تمام نسل بزرگان اگر نکو باشند
ز بحر زادہ، تنک ظرفی حباب چرا است

گر بقسمت قانعی بیش و کم دنیا یکے است
تشنہ چوں یک جرعہ خواہد کوزہ و دریا یکیست

پست فطرت ہوس گوشۂ عزلت نکند
تا گدا بر سرِ رہ نیست دلش خرم نیست

امروز چراغ اہل فقرم
چوں فانوسم دو پیراہن نیست

خاکساران بیشتر از فیض قسمت می برند
کلبۂ دیوار کوتاہاں پر از مہتاب بود

چشم از جہاں بہ بستم نورِ دلم فزودن شد
روشن شدہ است خانہ چو روزنش گرفتم[2]

اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری صرف قوت تخئیل کا نام ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو کلیم قوت تخیل

[1] یعنی جو شخص مدارج معرفت طے کر کے منزل تک پہنچ گیا ہو [2] یہاں گرفتن کے معنی بند کرنے کے ہیں،

ہمہ تن شاعری ہے، اس کا ہر شعر قوتِ تخئیل کا ایک منظر ہے، شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات، قوتِ تخئیل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت میں نظر آتے ہیں، مثلاً ہوا کے زور سے پھول کا ایک پتہ ٹہنی سے ٹوٹ کر پانی میں گر پڑا، یہ ایک معمولی واقعہ ہے، لیکن شاعر کو قوتِ تخئیل سے نظر آتا ہے کہ یہ بہار کے حسن کا دفتر ہے اور چونکہ معشوق کے حسن کے سامنے اس کی قدر نہیں ہوسکتی، اس لئے بہار نے اس دفتر کو پانی سے دھو ڈالنا چاہا ہے،

برگ گل نیست کہ از باد، در آب افتادہ است　　　دفتر حسنِ بہارست کہ در عہدِ تو شست

کلیم کے کلام کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ مناظر عالم کی ایک ایک چیز پر اس کی نظر پڑتی رہتی ہے اور قوتِ تخئیل سے یہ چیزیں اس کے سامنے نئے نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں،

وہ اندھیری راتوں میں گھبراتا ہے اور اس کو نظر آتا ہے کہ ستاروں کے چراغ میں روغن نہیں رہا،

شکوہ کم کن، در چراغِ اختران روغن نماند　　　بعد ازیں تاریکیِ شبہا بجو خوش کن کلیم

حکما کہتے ہیں کہ عالم کا آغاز اور انجام معلوم نہیں، کلیم کی نظر میں قوتِ تخئیل سے عالم ایک پرانی کتاب بن کر نظر آتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے اول و آخر کے ورق گر گئے ہیں،

اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادہ است　　　ما ز آغاز و ز انجام جہاں بیخبریم

محتسب کی دار و گیر نے میخانے برباد کر دیئے، لیکن کلیم یہ کہتا ہے کہ معشوق کی آنکھیں میکدہ ہیں اور اسکی مستی کے آگے شراب کی قدر نہیں، اس لئے کوئی شخص میخانوں کی طرف رخ نہیں کرتا، اور وہاں خاک اڑنے لگی، اس کے نزدیک یہ محتسب کی کارگذاری نہیں بلکہ محتسب معشوق کی آنکھ کا ممنون ہے،

شکر چشم تو کند محتسب شہر کزد ہر کجا میکدہ ہست خراب افتادہ است

بہار میں ہر شخص چاہتا ہے کہ سب سے پہلے پہونچ کر لب جو پر قبضہ کرے، کلیم کی وسعت تخئیل دیکھو، وہ سبزہ سے بھی پہلے، لب جو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے،

در بہاران جائی افتد بدستِ کس بباغ پیشتر از سبزہ می باید کنارِ جو گرفت

بہار میں کسی کو جگہ باغ میں نہیں ملتی، اسلئے سبزہ سے بھی پہلے چل کر لب جو پر قبضہ کر لینا چاہئے۔

صبح کے وقت کلیوں کی شگفتگی، ہر شخص کو لطف دیتی ہے، لیکن دیکھو کلیم اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے،

شیرینی تبسم ہر غنچہ را مپرس در شیر صبح، خندۂ گل ہا شکر گذاشت

کلیوں کی شیرینی تبسم کا لطف نہ پوچھو، پھولوں کی ہنسی نے صبح کے دودھ میں شکر گھولدی

سب لوگ کہتے آئے ہیں کہ آسمان قابل آدمیوں کا دشمن ہے، کلیم کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ آسمان کو قابل اور ناقابل کی تو تمیز ہی نہیں، قابل آدمیوں کو پہچانتا کیونکر ہے کہ خاص انہی کو ستاتا ہے،

حیرتے دارم کہ گردوں چو بدانایاں بد است او کہ نتواند میانِ نیک و بد تمیز کرد

آگ کی لو اکثر اونچی ہو ہو کر کم ہو جاتی ہے، کلیم کو نظر آتا ہے کہ شعلہ میں ضبط کی طاقت نہیں اس لئے بیقراری کی وجہ سے اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، اس کے مقابلہ میں اپنے سکون اور استقلال پر فخر کرتا ہے،

شعلہ بر می خاست از بے طاقتی و می نشست من نہ جنبیدم ز جا تا جا بہ گلخن داشتم

مر کر کوئی زندہ نہیں ہوتا، کلیم کو اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ کوئی شخص دوبارہ اس کے دیکھنے کی طرف رخ نہیں کرتا،

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست　　رو پس نہ کرد، ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

رہ نوردی میں پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں، انہی میں کانٹے بھی چبھتے جاتے ہیں، کلیم سمجھتا ہے کہ یہ انگلیاں ہیں، اور راستہ ان انگلیوں سے میرے چھالوں کا حساب لے رہا ہے،

دارم رہے بہ پیش کز انگشت خارہا　　از من حسابِ آبلۂ پا گرفتہ است

کلیم ان مضامین سے جو مدتوں سے جولانگاہ خیال ہیں ایسے نکتے پیدا کرتا ہے، جنکی طرف کسی کا خیال نہیں گیا،

مثلاً یہ اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے،

ایں قدر فرق میانِ خط یک کاتب چیست　　سرنوشتِ ہمہ گر از قلمِ تقدیر ست

اگر سب کی سرنوشت تقدیر ہی نے لکھی ہے تو ایک کاتب کے خط میں اس قدر فرق کیوں ہے کہ ہر شخص کی تقدیر الگ الگ ہے،

جنوں اور صحرانوردی کا مضمون سب باندھتے آتے ہیں، کلیم باوجود ادعاے جنون کے صحرانوردی اختیار نہیں کرتا اور اس سے جنوں کا زیادہ زور ثابت کرتا ہے،

اگر بہ بادیہ گردی نمی روم، چہ عجب　　جنونِ من نہ شناسد ز شہر صحرا را

میں اگر صحرا میں نہیں جاتا تو تعجب کیا ہے　　میرا جنون شہر اور صحرا میں تمیز نہیں کر سکتا

اس میں صحرانوردوں پر چوٹ بھی ہے کہ پورا جنون ہوتا تو ان کو شہر اور صحرا کی تمیز کیونکر ہوتی کہ جب بھاگتے تو صحرا ہی کی طرف بھاگتے،

عنقا کا تجرد اور ترکِ تعلقات، عام مضمون ہے، کلیم اسکے تجرد کو ناتمام سمجھتا ہے،

در کیشِ ما تجرد عنقا تمام نیست　　در فکر نام ماند اگر از نشان گذشت

زمانہ کی انقلاب پسندی کے سب مدعی ہیں، کلیم کو اس پر تعجب ہے کہ پھر میری حالت کیوں نہیں بدلتی،

زانقلابِ سپہر دورو، عجب دارم — کہ بیقراری مارا بہ یک قرار گذاشت

باغباں اور گلچیں ہمیشہ پھول توڑتے ہیں، کلیم کلیوں کا توڑنا ثابت کرتا ہے، اور اسکی کس قدر عمدہ توجیہ کرتا ہے،

درگلستاں، بہ یادِ دہانِ تو غنچہ را — امسال باغباں ہمہ نشگفتہ چیدہ بود

باغباں کو تیرا دہن یاد آیا، تو اس نے — اب کی سال تمام پھول بن کھلے توڑ لئے

حسنِ اخلاق کی بڑی دلیل، لوگوں کے نزدیک قبولِ عام ہے، یعنی جب آدمی کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں، جب ہی مقبولِ عام ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے، نہیں، بلکہ نفاق سے یہ درجہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ظاہرداری کے بغیر حسنِ قبول نہیں حاصل ہوسکتا اور ظاہرداری درحقیقت نفاق ہے،

پسندِ خاطرِ یک تن نیم چہ چارہ کنم — کہ بے نفاق بہ یک دل نمی تواں جا کرد

جو لوگ بیقاعدہ کام کرتے ہیں، ان کی بے قاعدگی اس قدر پختہ ہوتی ہے کہ کبھی بھولکر بھی کوئی کام باقاعدہ نہیں کرتے، کلیم اس سے یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ وہ بے قاعدہ نہیں کیونکہ ان کی بے قاعدگی باقاعدہ ہے، اس خیال کو ایک شاعرانہ پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

گاہے، بہ غلط ہم سوے مقصود نہ رفتیم — گویا رہِ آوارگیم، راہبرے داشت

ہم بھولکر بھی کبھی مقصد کی طرف ایک قدم نہیں گئے، معلوم ہوتا ہے کہ آوارگی کے راستہ میں ہمارا کوئی رہبر نہیں

زاہد کی صد دانہ تسبیح پر شعرا اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن کلیم اسکی ضرورت ثابت کرتا ہے

دانہ بسیار در کار ست، بہرِ صیدِ خلق — حق بدستِ زاہد ست، ار سبحہ را صد دانہ ساخت

راہِ طلب میں منزلِ مقصود کے رخ پر چلا جانا اور ادھر ادھر مڑ کر نہ دیکھنا مستحسن خیال کیا جاتا ہے لیکن کلیم کہتا ہے،

طلبِ شاہدِ مقصود ز ہر سو شرط ست ہر قدم در رہ او، رو بقفا باید کرد

شاہدِ مقصود کو ہر رخ سے ڈھونڈھنا ضروری ہے اس لئے اس راہ میں ہر قدم پر مڑ کر بھی دیکھنا چاہیئے،

روزمرہ اور محاورہ

اس زمانہ میں اگرچہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے استیلا نے زبان اور محاورہ بندی کی طرف سے شعرا کو غافل کر دیا تھا، چنانچہ ناصر علی، غنی، بیدل، اسی چکر میں پڑ کر لطفِ زبان سے بیگانہ ہو گئے، لیکن کلیم باوجود اتنہا درجہ کی نازک خیالی کے یہ سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، وہ ہمیشہ نئے مضامین پیدا کرنے کی فکر میں مصروف رہتا ہے لیکن یہ نہیں بھولتا کہ وہ ایرانی ہے، ہندی نہیں، اس لئے روزمرہ کے علاوہ، اکثر ٹھیٹ محاورے برتتا ہے، جن کو عام آدمی فرہنگ کے بغیر سمجھ بھی نہیں سکتے، مثلاً

با عارض تو چہرہ شدن حد شمع نیست	چہرہ شدن مقابل ہونا، حد نیست یعنی مجال نہیں
گریاں ز بزم رفت و سرخویشتن گرفت	سرخویشتن گرفت، اپنی راہ لی
از دبستاں برود ہر کہ سبق روشن کرد	سبق روشن کرد، سبق یاد کر لیا،
ع، دشمن خود را چرا کس ایں قدر پہلو دہد	پہلو دہن، پہلو بچانا،
رو نخواہم ساخت ہر صورت کہ خواہد رو دہد	رو ساختن، منہ بگاڑنا، رو دہد، پیش آئے،
امیدِ بوسہ ات چہ نمک داشت اے کلیم،	چہ نمک داشت، یعنی اس میں کیا لطف تھا،
ایں شربت کم بہر دو بیمار بنا شد	بہر حصہ، یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ تھوڑا سا شربت دو بیماروں کے لئے کافی نہ ہو،
کہ کاہ ہم طرف کہربا نمی گیرد	طرف کسے گرفتن، اس کی جانب داری کرنا،

ع، بچشم روشنی داغہاے کہنہ روم	چشم روشنی امبارک باد
ع شام، خود شد روزہ امید را وامی کنم	روزہ واکردن، روزہ کھولنا،
چوں حباب، دوام ہستی پس دہم خنداں شوم	دام واپس دادن، قرضہ ادا کرنا،
عجب پیرے کہ می مالد جواں را	مالیدن، پچھاڑنا
یک زبانم من و نمی گویم	پشت درو داشتن سخن، یعنی
سخن را کہ پشت درو دارد	دورخی بات،
پیالہ چشم تو روشن کہ بادہ پیدا شد	چشم تو روشن، دعا کے موقع پر استعمال کرتے ہیں،

اب ہم کلیم کی دو تین غزلیں پوری پوری اس موقع پر درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کا کلام اکثر یک دست اور ہموار ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کے عام لطف بندش جدت ادا اور خوبی زبان کا اندازہ ہوگا،

پیری رسید و مستیِ طبعِ جواں گذشت — ضعفِ تن از تحملِ رطلِ گراں گذشت

وضعِ زمانہ، قابلِ دیدن دوبارہ نیست — رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

از دست بُردِ حسنِ تو، بر لشکرِ بہار — یک نیزہ خونِ گل زسرِ ارغواں گذشت

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے — یا ہمتے کہ از سرِ عالم، تواں گذشت

درکیشِ ما تجرد عنقا تمام نیست — در فکرِ نام ماند اگر، از نشاں گذشت

بے دیدہ راہ اگر نتواں رفت، پس چرا — چشم از جہاں چو بستی، از و می تواں گذشت

بدنامیِ حیات، دو روزی نبود بیش — آں ہم کلیم با تو بگویم، چساں گذشت

یک روز، صرفِ بستنِ دل شد باین و آں — روزے دگر، بہ کندنِ دل زین و آں گذشت

نه همی می رسد، آن نوگلِ خندان از من — می کشد خار دریں بادیه دامان از من

بامن آویزشِ او، الفتِ موجست و کنار — دمبدم بامن و هر لحظه گریزان از من

گرچه مورم ولے آن حوصله با خود دارم — که به بخشم، بود ار ملکِ سلیمان از من

به تکلّم، به خموشی، به اشارت، به نگاه — می تواں برد بهر شیوه دل آسان از من

قمری، ریخته بالم، به پناهِ که روم؟ — تا به کے سرکشی اے سروِ خرامان از من

نیست پرهیزِ من از زهد، که خاکم بر سر — ترسم آلوده شود دامنِ عصیان از من

اشکِ بیهوده مریز این همه از دیده کلیم — گردِ غم را نتوان شست بطوفان از من

از ثباتِ عشق، دایم پا بدامن داشتم — همچو داغِ لاله، در آتش نشیمن داشتم

شعله بر می خاست از بے طاقتی و می نشست — من نه جنبیدم ز جا تا جا بگلخن داشتم

کے بهر نامحرمے، چاکِ جگر خواهم نمود — من که زخمش را نهان از زخمِ سوزن داشتم

هیچ گه، ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت — دانه می چیدم من آن روزے که خرمن داشتم

روشنی از بزمِ من، دریوزه می کرد آفتاب — در چراغِ عیش تا از باده روغن داشتم

همچو ماهی غیرِ داغم، پوششِ دیگر نبود — تا کفن آمد، همیں یک جامه بر تن داشتم

داغ را جز بر کنارِ زخم ننهادم کلیم
دیده را بر رخنهٔ دیوارِ گلشن داشتم

ادبی کتابیں

شعرالعجم حصۂ اوّل

فارسی شاعری کی تاریخ جس مین شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیون اوران کے خصوصیات واسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے اوراسی کے ساتھ تمام مشہور شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اوراُن کے کلام پر تنقید وتبصرہ ہے، قیمت :- عہ/

شعرالعجم حصۂ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ اوراین یمین تک) معہ تنقید کلام، قیمت :- عہ/

شعرالعجم حصۂ چہارم

اس حصہ مین تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب وہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور شاعری کے تمام انواع واقسام مین سے مثنوی پر بسیط تبصرہ، قیمت :- عہ/

شعرالعجم حصۂ پنجم

اس مین قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید وتبصرہ ہے، قیمت: عہ/ مکمل سیٹ لہ عہ/

مسعود علی ندوی — منیجر — دارالمصنفین اعظم گڈہ

(طابع وناشر محمد اویس وارثی)